جلاوطن وزیراعظم

تہہ در تہہ واقعات کی کہانی

تحریر: ڈاکٹر سعید الٰہی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: جلاوطن وزیراعظم

تحریر: ڈاکٹر سعید الٰہی

پبلشرز: حافظ پبلشرز
غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
فون: 042-7210290
فیکس: 042-7210390

پرنٹرز: اعزازالدین ٹی۔بی۔ایم پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ: سیّد علی گیلانی

سالِ اشاعت: جون 2006ء

قیمت: -/250 روپے

تعارف

ڈاکٹر سعید الٰہی نے سینٹرل ماڈل سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد علامہ اقبال میڈیکل کالج، لاہور سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔ معروف طالب علم راہنما رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن پنجاب کے سیکرٹری جنرل اور پھر صدر رہے ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ دس سالہ سرکاری ملازمت سے بطور احتجاج مستعفی ہوئے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں سکول اور میڈیکل کالج قائم کیے۔ انہوں نے سرکاری اور غیر سرکاری حیثیت میں عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی، کئی ملکی و بین الاقوامی این۔جی۔اوز کے عہدیدار رہے اور سماجی کارکن ہیں نواز شریف سے محبت کرتے ہیں اور ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

منجانب:

ادارہ

This page is empty

ترتیب

-1	پیش لفظ	7
-2	12 اکتوبر 1999ء	9
-3	پراسرار مہمان کی حیرت انگیز گفتگو	13
-4	اسیری کی پہلی صبح	25
-5	نا جھکنا ہے نہ بکنا ہے	31
-6	بغاوت کی ایف آئی آر	39
-7	اٹک قلعے سے کراچی کی عدالت میں پیشی	45
-8	اٹک قلعہ کی خوفناک جیل	49
-9	طیارہ اغوا کیس میں سزا اور اٹک میں اسیری	59
-10	جلاوطنی کے بعد مدینہ منورہ میں نواز شریف سے پہلی ملاقات	65
-11	سیکورٹی چیف کے سخت اشارے	75
-12	مدینہ منورہ سے جدہ روانگی	79
-13	سرور پیلس کا قیام	83
-14	پسندیدہ کھانے اور مشروب	95
-15	بادشاہ نواز شریف کہنے والی زین ضیاء	97
-16	ہر دلعزیز لیڈر کیسے بنا ؟	101

-17	موٹروے کی تعمیر پر موقف۔ مقاصد کیا تھے؟	109
-18	لاہور کا علامہ اقبال ایئرپورٹ	115
-19	ییلو کیب سکیم کا خواب	119
-20	ٹیلیفون کی سہولت	121
-21	عدل وانصاف کی فراہمی	123
-22	نواز شریف کی کھلی کچہری	125
-23	پاکستان میں ٹورازم کا فروغ	127
-24	پاکستان کے ایٹمی دھماکے اور پاک بھارت تعلقات	131
-25	کارگل کی جنگ۔ ذمہ دار کون تھا؟	137
-26	مختلف شخصیات کے بارے میں تاثرات	141
-27	ذکر چند اخبار نویسوں کا	145
-28	جو وفاداری بدل گئے	155
-29	دوست، دوست نہ رہے	157
-30	مہمان علمائے کرام	159
-31	ماڈل ٹاؤن والے گھر پر کیا بیتی	163
-32	8 اکتوبر 2005ء کا ہلاکت خیز زلزلہ	167
-33	حسن نواز کی علالت	175
-34	سرور پیلس میں آخری مجلس	181

پیش لفظ

میاں محمد نواز شریف اُس خود دار اور خود ساز خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو خارزارِ سیاست کی آبلہ پائی سے دامن بچا کر اپنی ''اقلیم صنعت'' کی تعمیر و ترقی اور تزئین میں ہمہ وقت منہمک و سرگرم عمل رہتا تھا۔ سیاسی منظر نامے کے نشیب و فراز اور بعض ارباب بست و کشاد کی نگاہ انتخاب نے میاں محمد نواز شریف کو کوچۂ سیاست کی پر اسرار آب و ہوا اور ایوان حکومت کی راہ داریوں اور غلام گردشوں کے پیچ و خم سے آشنا کر دیا۔ انہوں نے فروغ و پیش رفت اور اوجِ درجات و عروج مقامات کے مراحل و منازل اس غیر معمولی برق رفتاری سے طے کیے کہ حلیف و رقیب بھی حیران اور ششدر رہ گئے۔ وہ صوبائی وزیر سے وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے۔ مشترکہ دوستوں کے وسیلے اور وساطت سے میرا اُن سے رسمی تعارف ہوا۔ آہستہ آہستہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اُن سے ملاقات لطف انگیز ہوتی تھی اور پھر اُن کے ایام جلاوطنی میں اُن سے مکۃ المکرمہ، مدینۃ المنورہ اور جدہ میں لاتعداد ملاقاتیں ہوئیں اور اُن سے تبادلہ خیال کا موقع حاصل رہا۔ اُن کی عالی ظرفی اور وسیع دسترخوان سے کام و دہن کی تواضع و مدارت کی خوشی بھی حاصل ہوئی۔ اس دوران مجھے انہیں نہایت قریب سے ملنے، دیکھنے اور نقد و نظر کے ترازو میں تولنے کی سہولت حاصل رہی۔ وہ قائدانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں، نہ بکتے ہیں نہ جھکتے ہیں، کوہ استقامت ہیں، غور و فکر اور مشورے کے بعد اپنے فیصلے از خود کرتے ہیں اور پھر اپنے مؤقف پر آہنی چٹان کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔ نجی زندگی میں راست رو ہیں۔ دوست پرور اور غریب نواز بھی ہیں۔ دشمنوں کے لیے فولاد اور دوستوں کے لیے ابریشم ہیں۔ اُن کی رگوں میں

حب الوطنی رقصاں ہے۔ اُن کے سینے میں مردِ مومن کا دل دھڑکتا ہے۔ مظلوم کی پکار پر کانپ اُٹھتے ہیں۔ اسلام کے شیدائی ہیں۔ مروت اور محبت کا پیکر ہیں۔ قربانی اُن کی خو میں شامل ہے۔

اقتدار سے معزولی اور جلاوطنی کو خندہ پیشانی اور بے پناہ حوصلے سے برداشت کر رہے ہیں اور وطن واپسی کے لیے ہر وقت پر امید رہتے ہیں۔ کئی دوسرے لیڈروں کے برعکس وہ سودے بازی کو مسترد کرتے ہیں، مزاحمت کی عظیم علامت ہیں اور اس دور میں اس روائت کے بانی بھی ہیں۔ وہ جمہوریت اور جمہوری اقدار کے بہادر علمبردار ہیں۔ اسی لیے ایک محبوب رہنما ہیں۔ عوام اُن کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ وہ مستقبل کے ایک متفقہ لیڈر ہی نہیں بلکہ فرمانروا بھی ہیں۔ اُن کی شخصی وجاہت، عادات اور دل و دماغ کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر میں نے یہ مختصر سی کتاب تحریر کی ہے یہ نواز شریف کی آپ بیتی بھی ہے اور جلاوطنی کی کہانی بھی ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

اس کتاب کو تحریر کرنے میں مجھے جناب تنویر قیصر شاہد کا خصوصی تعاون حاصل رہا، جناب حافظ جاوید اقبال، جناب اعزاز الدین، سید علی گیلانی اور خالد شہزاد نے بھی میرا بہت ساتھ دیا۔ اِن سب کی محبت اور محنت کے بغیر میرے خیالات اس طرح آپ تک نہ پہنچ پاتے۔

ڈاکٹر سعید الٰہی

12 اکتوبر 1999ء

12 اکتوبر 1999ء ایک چمکتا ہوا دن تھا۔ موسم گرما رخصت ہو رہا تھا اور فضا میں تبدیلی واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ بالائی علاقوں میں سرد ہواؤں کا آغاز ہو چکا تھا اور پنجاب کے بالائی اور مرکزی علاقے بھی خنک ہو گئے تھے۔ تاہم دوپہر کے وقت ہلکی سی حدت برقرار تھی۔ جنوبی پنجاب میں یہ احساس نسبتاً زیادہ تھا کیونکہ ان علاقوں میں گرمی زیادہ پڑتی ہے اور دیر سے جاتی ہے۔ 12 اکتوبر کی دوپہر کو بھی سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا گرمی تھی مگر لوگ اس گرمی میں بھی خوش تھے۔ کیونکہ اُن کے محبوب وزیراعظم میاں محمد نواز شریف جنوبی پنجاب کے ایک معروف شہر شجاع آباد کے دورے پر تشریف لا رہے تھے۔ ملتان سے کچھ فاصلے پر آباد اس شہر کی کپاس اور آموں نے دنیا بھر میں دھوم مچا رکھی ہے۔

خلاف معمول نواز شریف جلسہ گاہ میں تاخیر سے پہنچے کیونکہ وہ سکیورٹی حکام کی ہدایت پر ملتان سے شجاع آباد ہیلی کاپٹر کے بجائے کار پر تشریف لائے تھے۔

چند روز قبل شجاع آباد کے ایک زمیندار کے بیٹے نے ایک غریب خاتون سے زیادتی کی تھی۔ پولیس نے حسب معمول اس مظلوم خاتون کی دادرسی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ملزم کی سرپرستی کر رہی تھی۔ ذرائع ابلاغ کے توسط سے ظلم کی یہ داستان جب نواز شریف کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ بے قرار ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ وہ از خود اسلام آباد سے چل کر مظلوم کے پاس جائیں گے اور اُسے اُس کی دہلیز پر انصاف فراہم کریں گے۔

وزیرِاعظم کی آمد کی خبر سن کر مقامی پولیس صبح ہی سے خوف زدہ تھی اور فریاد کرنے والی خاتون اور اُس کے ورثاء نے وزیرِاعظم کے دورہ سے بہت اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

شجاع آباد میں منعقد ہونے والا یہ جلسہ اپنی مثال آپ تھا۔ نواز شریف زیادتی کا شکار ہونے والی خاتون کے پاس گئے اور اُن مقامی پولیس افسران کے احتساب کے احکامات جاری کیے جنہوں نے ایف۔آئی۔آر درج کرنے سے انکار کیا تھا۔اُنہوں نے چوبیس گھنٹے کے اندر ملزمان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔

ان اعلانات کے ساتھ مظلوم خاندان نواز شریف کی درازی عمر اور صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے دارالحکومت سے متصل شہر میں ایک خوفناک سازش کے تانے بانے بنے جا رہے تھے جنہوں نے چند ہی لمحوں بعد تاریخ پاکستان پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کرنا تھے۔

سورج نصف النہار پر تھا اور نواز شریف جلسہ عام میں گرج رہے تھے اچانک اُن کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ایک پُر اسرار فون تھا جس کا پیغام نواز شریف تک فوراً پہنچا دیا گیا۔ نواز شریف نے احسن انداز میں اپنا خطاب سمیٹا اور کسی کو اندازہ تک نہ ہوا کہ اُس فون نے ہر شے کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ کسی مقبول سیاستدان کے لیے جلسے کو اچانک سمیٹ کر تقریر ختم کرنا خاصہ دشوار ہوتا ہے لیکن یہ کام بھی ہو گیا اور نواز شریف فوری طور پر شجاع آباد سے بذریعہ کار ملتان پہنچ گئے۔

مقامی سیاستدان، افسران اور نواز شریف سے محبت کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے ورکرز، ووٹرز اور سامعین سب اپنی اپنی جگہ حیران و

پریشان تھے کہ اچانک کیا افتاد آن پڑی کہ سب کچھ ادھورا اور تشنہ چھوڑ کر وزیراعظم اسلام آباد روانہ ہوگئے۔ نواز شریف نے شجاع آباد سے ملتان ائیر پورٹ پہنچ کر فوری طور پر اپنے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی کو فون کیا کہ وہ اسلام آباد ائیر پورٹ پہنچ کر اُن سے ملاقات کریں یہ کال سعید مہدی کے لیے حیرت انگیز بھی تھی اور ایک اُفتاد سے کم بھی نہ تھی کیونکہ وہ اُس روز آرام کرنے کے موڈ میں تھے جانتے تھے کہ وزیراعظم شجاع آباد کے دورے پر ہیں اور شام گئے لوٹیں گے اس خیال سے وہ صبح کو دیر تک سوئے رہے۔ شیو بھی نہ کی اور خلاف معمول ناشتہ بھی تاخیر سے کیا۔ وزیراعظم کا فون سنتے ہی اُن کے اعصاب تن گئے اور ایک انجانا سا خوف اُن کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ وزیراعظم کے ساتھ کام کرنا معمولی بات نہیں ہے وہ برسوں سے یہ فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے باوجود اطمینان کا سانس لینے میں دشواری محسوس ہورہی تھی۔

وہ جلدی جلدی تیار ہوئے اور ناشتے پر مدعو اپنے مہمانوں کو الوداع کہتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوگئے، وہیں پر اپنی جیکٹ پہنی، جوتوں کے تسمے باندھے اور ڈرائیور کو تیزی سے ائیر پورٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

This page is empty

پراسرار مہمان کی حیرت انگیز گفتگو

گاڑی میں سوار ائیر پورٹ کی طرف رواں سعید مہدی کے لیے وزیراعظم کی یہ کال پریشان کن تھی۔ انہیں رہ رہ کر چندروز قبل اپنے گھر میں، جو وزیراعظم ہاؤس کے اندر ہی تھا، ایک مہمان کی گفتگو یاد آ رہی تھی۔ چندروز پہلے وہ اپنے گھر میں ناشتہ کررہے تھے۔کھانے کی میز پر گھر کے چند افراد کے علاوہ ایک ''مہمان'' بھی تھا۔ اچانک گفتگو کا رُخ نواز شریف کے سیاسی فیصلوں اور غیر جمہوری قوتوں کی سازشوں کی طرف مڑ گیا۔ مہمان نے سعید مہدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''لگتا ہے جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کی سیاسی بساط اُلٹنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' سعید مہدی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کیسی بات کرتے ہو جنرل مشرف اپنے آدمی ہیں، میں نے ہی انہیں سب سے پہلے نواز شریف سے ملوایا تھا بھلا وہ وزیراعظم کے خلاف ایسا غیر قانونی اقدام کیوں کریں گے؟ کوئی غیر سیاسی اور غیر دانشمندانہ فیصلہ کیوں کریں گے لیکن سعید مہدی کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ناشتے کی میز پر موجود پراسرار مہمان نے ایک بار پھر پُر اعتماد لہجے میں کہا ممکن ہے آپ نے جنرل مشرف کو وزیراعظم نواز شریف سے ملوایا ہو لیکن مجھے اسلام آباد کی فضا میں سازش کی بو آ رہی ہے۔بات آئی گئی ہوگئی۔ اِسے یاد کر کے سعید مہدی چونک اُٹھے اور وہ ائیر پورٹ کی طرف بھاگتی ہوئی گاڑی کے باہر دیکھنے لگے جہاں دوپہر کا سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ سعید مہدی کو یہ خیال بھی رہ رہ کر تنگ کررہا تھا کہ آخر وزیراعظم کو کن وجوہ کی بنا پر اچانک اسلام آباد آنا پڑا۔ وزیراعظم کے سب پروگرام پرنسپل سیکرٹری کے علم میں ہوتے ہیں اور اُس شام انہیں دارالحکومت میں کوئی ضروری کام نہ

تھا اسی بارے میں سوچتے سوچتے سعید مہدی پریشان ہو رہے تھے جب وہ اسلام آباد ہائی وے پر کھنہ پل کے قریب پہنچے تو انہیں سامنے سے وزیراعظم نواز شریف کا کانوائے نظر آیا۔ آمنا سامنا ہوا۔ نواز شریف نے فوراً انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیا اُن کی گاڑی سے جنرل افتخار (سیکرٹری دفاع) اتر کر سعید مہدی کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور یہ کارواں دوبارہ وزیراعظم ہاؤس کی جانب روانہ ہو گیا گاڑی میں کوئی بات نہ ہوئی لیکن خاموش نگاہیں اور دھڑکتے ہوئے دل کوئی کہانی ضرور سنا رہے تھے۔

نواز شریف وزیراعظم ہاؤس پہنچے اور جنرل مشرف کی برطرفی کے احکامات جاری کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو نیا چیف اور آرمی سٹاف مقرر کر دیا اور انہیں جی ایچ کیو جا کر اپنا چارج لینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مخصوص دفتر میں سعید مہدی سے محو گفتگو ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پسندیدہ کافی کا کپ بھی منگوالیا تھا۔ میاں شہباز شریف اپنی خواب گاہ میں محو استراحت تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی تبدیلی کے احکامات جاری کرنے کے باوجود وزیراعظم ہاؤس میں خوف کی فضا تھی۔ نواز شریف نے گھمبیر خاموشی میں کافی کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ کور کمانڈر راولپنڈی جنرل محمود اور جنرل علی جان اورکزئی بیس پچیس مسلح فوجی جوانوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اُن کے ساتھ چند فوجی افسر بھی تھے وہ سب باوردی تھے افسروں کے کاندھوں پر چاند اور ستارے تو ضرور چمک رہے تھے لیکن اُن کی یونٹ اور شناخت کے تمام نشانات غائب تھے۔ وہ سب جی تھری اور اے۔ کے 47، کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح تھے اُنہوں نے آتے ہی آداب و اطوار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بندوقیں منتخب وزیراعظم نواز شریف کی طرف تان دیں۔ یہ بداخلاقی بھی تھی اور وزارت عظمیٰ کے بلند آئینی منصب کی بے حرمتی بھی۔ ان باوردی نوجوانوں اور افسروں نے

احکامات کی پیروی کرتے ہوئے پاکستان کے اُس منتخب وزیراعظم کو نرغے میں لے کر اُس کے سر پر بندوقیں تان رکھی تھیں جس نے تاریخ پاکستان کا سب سے بھاری مینڈیٹ لے کر عنان حکومت سنبھالی تھی۔

وزیراعظم کے پرشکوہ دفتر میں داخل ہوتے ہی جنرل محمود نواز شریف کی طرف بڑھے اور بلند آواز میں اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''یہ کیا کیا ہے آپ نے؟'' جنرل محمود کے لہجے میں تحکم اور بے ادبی کے عناصر غالب تھے لیکن نواز شریف نے بڑے تحمل اور برد باری سے ان الفاظ کو سنا اور چند لمحوں کے توقف سے کہا: ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''آپ نے جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر دیا ہے اور نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے کیا کیا ہے''۔ جنرل محمود نے اُسی حاکمانہ اور گستاخ لہجے میں اکڑ کر کہا۔ لیکن نواز شریف کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ غالباً ان کے ذہن میں پاکستان کی گزشتہ نصف صدی کے وہ سارے واقعات اور المیے گھوم گئے تھے جب جرنیلوں نے منتخب حکومت کا تختہ اُلٹا۔ منتخب وزرائے اعظم کو ایوان اقتدار سے نکالا، یہاں تک کہ ایک کو تختۂ دار پر بھی لٹکا دیا۔ تاریخ کے انہی واقعات کا سحر اور اثر تھا کہ انہوں نے نہایت صبر و سکون سے جنرل محمود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں اس ملک کا منتخب وزیراعظم ہوں پارلیمینٹ میں میری اکثریت ہے آئین پاکستان نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں چیف آف آرمی سٹاف کو برطرف کر کے کسی بھی نئے جرنیل کو اس عہدے پر تعینات کر سکتا ہوں۔ جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے میں نے کوئی غیر قانونی اقدام نہیں کیا''۔

یہ الفاظ کور کمانڈر راولپنڈی جنرل محمود کو نہایت ناگوار گزرے اور انہوں نے بلند آواز میں کہا: ''آپ کو معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟'' یہ ایک دھمکی تھی اور یہ تماشا اُن افسران اور فوجی جوانوں کی موجودگی میں ہو رہا تھا جو ابھی تک نواز شریف پر بندوقیں تانے ہوئے تھے۔ نواز شریف نے دائیں ہاتھ سے ان بندوق برداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنرل محمود سے کہا: ''یہ سب آپ جو کر رہے ہیں آپ کو پتہ ہے اس کا انجام کیا ہوگا آپ ایک آئینی حکومت ختم کر کے فوجی قبضہ کی کوشش کر رہے ہیں اور کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آئین نے یہ حرکت کرنے والوں کے لیے کیا سزا تجویز کر رکھی ہے؟''

''ہمیں سب پتہ ہے، ہمیں یہ بتانے کی تکلیف نہ کریں۔ سزا کے بارے میں سوچنا آپ کا دردِ سر نہیں'' غصے میں بل کھاتے ہوئے جنرل نے کہا: ''آپ فوراً جنرل پرویز مشرف کی برطرفی کے احکامات واپس لے لیں ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔ تاخیر کا وقت نہیں ہے۔''

وزیراعظم نواز شریف کے دفتر میں قیامت کی یہ گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ تہہ در تہہ بنے وزیراعظم ہاؤس کے کسی کونے سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ موت کا سکوت طاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کی آوازیں حلق میں دبا دی گئی ہوں۔ خاموشی اور سکوت کے اس عالم میں نواز شریف کی بے خوف آواز گونجی۔ ''نہیں میں یہ نہیں کروں گا'' اُن کے مستحکم لہجے سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ انہوں نے جنرل محمود کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا ہے اور اُن کے مختصر جملے نے یہ کہانی بھی جنرل محمود پر افشا کر دی تھی کہ بندوقوں کے سائے میں منتخب وزیراعظم سے فیصلے کروانے کے دن گزر گئے۔ ماضی میں یقیناً ایسا ہوتا رہا ہوگا لیکن

اب ایسا نہیں ہوگا۔ بہت ہو چکا۔ نواز شریف کے مختصر الفاظ تاریخ کے سینے پر سنہری تمغے کی طرح آویزاں ہو چکے تھے۔ نواز شریف کا جواب ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وزیراعظم کے دفتر میں فون کی گھنٹی بجی جس نے ساکت اور تھمی فضا کو مرتعش کر دیا گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اُس نے جنرل محمود کے تیوروں میں اضافہ کر دیا تھا۔ انہوں نے نہایت تلخ لہجے میں ساتھ آئے ایک نوجوان کپتان جس کے کاندھے پر لگے فوجی ستارے، وزیراعظم کے کمرے میں نصب تیز روشنیوں میں دمک رہے تھے، کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”تم نے ہاؤس کے سارے فون نہیں کاٹے؟ ایک جرنیل کے سامنے ایک کپتان کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ وہ جرنیل کی گرجتی ہوئی آواز سے دہشت زدہ ہوگیا، آگے لپکا اور ایک جھٹکے سے فون کی تار کھینچ ڈالی۔ فون مردہ ہو کر رہ گیا۔ اس ڈرامے میں جنرل علی جان اورکزئی نے نہایت متانت کا مظاہرہ کیا اور کہیں بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وزیراعظم سے مخاطب ہوتے ہوئے یا احکامات جاری کرتے ہوئے کہیں بھی درشتگی کا عنصر قریب نہ آنے دیا۔

وزیراعظم ہاؤس میں موجود سیریمونیل گارڈ نے عملی طور پر وزیراعظم ہاؤس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُن کا رویہ خاصہ جارحانہ تھا۔ انہوں نے جنرل ضیاءالدین اور اُن کے ساتھ آئی۔ایس۔آئی کے گارڈز سے بھی سخت الفاظ استعمال کیے۔ قبضہ کرنے کے لیے 111 بریگیڈ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو کہ وزیراعظم ہاؤس کے قرب و جوار میں تعینات تھا۔ اس کے علاوہ چراٹ سے بلائی گئی ایس۔ایس۔جی کی دو کمانڈو یونٹس بھی وزیراعظم ہاؤس کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو چکی تھیں ایک اطلاع کے مطابق ایک وقت میں تقریباً تین ہزار مسلح افراد وزیراعظم ہاؤس میں موجود تھے اور وزیراعظم ہاؤس بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کے محاصرے میں تھا۔

OVER MY DEAD BODY

وہ منظر کیسا ہوگا جب پاکستان کے پرشکوہ دارالحکومت کے خوبصورت اور مزین وزیراعظم ہاؤس میں نواز شریف ایک ماتحت جرنیل کی دھمکیوں کا سامنا کر رہے تھے۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں ہاؤس پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اسلام آباد کی یہ اہم شاہراہ جس کے کنارے وزیراعظم ہاؤس ایستادہ ہے اور جس کے آس پاس تمام غیر ملکی سفارت خانے قائم ہیں، سپریم کورٹ کی عمارت اور ایوان صدر سے بھی سجی ہے۔ ان بلند عمارتوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور وزیر اعظم ہاؤس میں اقتدار پر قبضے کا آخری لمحہ عمل میں آ رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور غالباً اقتدار کا آفتاب بھی ڈوبنے کو تھا۔ یہ گھڑیاں قیامت خیز تھیں۔ غالب قوتیں وہی تھیں جنہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے بنائے ہوئے اس پاک وطن میں اس سے پہلے بھی فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاٗ الحق کی شکل میں آئین کو پامال کیا تھا اور اسے کاغذ کا ایک معمولی ذرّہ اور بے حقیر کتاب قرار دے کر اس کا مذاق اُڑایا تھا۔ یہی قوتیں ایک بار پھر اپنا کھیل کھیلنے کے لیے وزیراعظم ہاؤس کا محاصرہ کر چکی تھیں مگر اب کردار بدل چکا تھا اور یہ کردار بہت مختلف تھا۔ وہ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونے کو زندگی کی توہین سمجھ رہا تھا، سر جھکانے کے بجائے سر دینے کے لیے آمادہ و تیار تھا۔

اپنی اخلاقی قوت سے توانائی حاصل کر کے نواز شریف نے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کھڑے بندوق برداروں کو حقارت سے دیکھا اور کہا: ''یہ بندوقیں ہٹاؤ، کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو'' جدید طرز کی بندوقیں تھامے جوانوں نے نواز شریف کے الفاظ پر توجہ دینے کی بجائے جنرل محمود کی طرف دیکھا اور بندوقیں وزیراعظم کے

چہرے پر تانے رکھیں۔ یہ منظر 1799ء کے اُس تاریخی واقعہ کی یاد دلاتا ہے جب سرنگا پٹم میں سلطان ٹیپو کے محل کا محاصرہ کیا گیا تھا یا 1857ء کا سال یاد آتا ہے جب دہلی میں ہمایوں کے مقبرے سے بہادر شاہ ظفر کو بندوقوں کے سائے میں گرفتار کیا گیا تھا۔

1799ء اور 1857ء میں محاصرہ کرنے اور گرفتار کرنے والے سات سمندر پار سے آئے تھے لیکن یہ سب تو اپنے تھے پھر ویسا ہی منظر کیوں؟

نواز شریف کی طرف سے نشان دہی کے باوجود بندوقیں تنی رہیں تو وہ خاموش ہو گئے۔ ناقابل فراموش اور تاریخ ساز گھڑیاں سُرعت سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسی اثناء میں نواز شریف کا موبائل فون بج اُٹھا، بات شروع ہوئی تو جنرل محمود نے فون بند کرنے کا حکم دیا، نواز شریف نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ہی فون بند کیا۔ اس کے بعد بے اختیار جنرل محمود آگے بڑھے اور نہایت غیر مہذب لہجے میں کہا: ''آپ کو جنرل مشرف سے بات کرنا ہوگی آپ باہر چلیں اور میرے موبائل فون پر اُن سے بات کریں۔'' اسی دوران جنرل محمود کے موبائل کی گھنٹی بجی دوسری طرف کون تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن جنرل محمود فون سنتے ہی مستعد ہو گئے اور کہا 'every thing is ok-sir'۔

نواز شریف ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ میں جنرل مشرف سے کیا بات کروں گا اور یہ لوگ مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہیں کہ جنرل محمود آگے بڑھے اور اُن سے کہا: ''آئیں جنرل مشرف سے بات کریں۔''

وزیراعظم نواز شریف اپنے دفتر سے باہر نکلے۔ وہ آگے آگے تھے اور

جنرل محمود اُن کے پیچھے۔ مسلح نوجوان ساری اطراف میں بندوقیں تانے ساتھ ساتھ تھے۔ اُن اعصاب شکن لمحات کی یاد کرتے ہوئے میاں محمد نواز شریف کہتے ہیں: ''جنرل محمود اور اُن کے ساتھی مجھے وزیر اعظم ہاؤس کی راہ داری میں لے آئے اور میں سمجھا وہ کھڑے ہو کر میری جنرل مشرف سے بات کروائیں گے میں لمحے بھر کو وہاں رُکا اور اُن سے بات کرنا چاہی لیکن وہ راہ داری میں رکے نہیں اور کار پورچ تک آگئے اور ڈرائیو وے میں کھڑی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں بیٹھنے کو کہا۔'' نواز شریف نے ان لمحوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں: ''میں نے جنرل محمود سے پوچھا آپ نے تو کہا تھا کہ میں جنرل مشرف سے بات کرواؤں گا۔ لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی جنرل محمود نے کہا۔ گاڑی میں تشریف رکھئے بات بھی ہو جائے گی۔ میرے بیٹھتے ہی سیاہ شیشوں والے یہ فوجی گاڑی نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔''

اسلام آباد۔ جس کے مقتدر ایوانوں کی غلام گردشوں میں ہمہ وقت سازشوں کے جال بُنے جاتے ہیں۔ پر ملگجی شام کے سائے اُتر آئے تھے۔ ہوا میں خنکی دم بہ دم بڑھ رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اقتدار کا غیر آئینی کھیل کون کھیل رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ نواز شریف کہتے ہیں میں گاڑی میں بیٹھا تو وزیر اعظم ہاؤس کو نظر بھر کر دیکھا۔ ساری عمارت کو فوج دستوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا اور کئی جوان پوزیشن لیئے کھڑے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ آئین کو پامال کرنے والی قوتیں اپنے کھیل کا آغاز کر چکی ہیں۔ مجھے جھٹکا سا لگا اور میں سوچنے لگا کہ عوامی حقوق پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے اور جمہوریت کی شمع گل کر دی گئی ہے۔ میرے جذبات میں جوار بھاٹا سا اُمڈ آیا تھا۔ مجھے وہ ساری

محنت اکارت ہوتی محسوس ہونے لگی، جو میں نے دن رات ایک کر کے ملک کے جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے اور عوامی نمائندوں کا اعتبار اور اعتماد بحال کرنے کے لیے کی تھی۔ گاڑی اسلام آباد کی شاہراہ آئین پر رواں تھی اور میرے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جس طرح یہ فوجی گاڑی شاہراہِ دستور اپنے ٹائیروں تلے روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اسی طرح آج ایک بار پھر آئین کو پامال کرتے ہوئے میرے جمہوری خوابوں کو سرابوں کی راہ دکھا دی گئی ہے۔ پاکستان کی مانگ میں جمہوریت کا سیندور بھرنے کے بجائے اس میں آئین کی پامالی کا خونی رنگ بھر دیا گیا ہے۔ گاڑی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اور میرے دل میں پاکستان اور اُس کی عوام کے بارے میں خطرات اور خدشات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ شام خاصی گہری ہو گئی تھی جب انہوں نے مجھے ایک فوجی میس میں اُتارا مجھے وہاں چھوڑ کر جنرل محمود اور دیگر فوجی افسران غائب ہو گئے۔

وہ آپ کو کہاں لے گئے، یہ جگہ کونسی اور کہاں ہو گی؟ میاں نواز شریف کہتے ہیں: ”میں راولپنڈی کے در و بام اور کوچہ و بازار سے خوب واقف ہوں اس فوجی میس کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ پشاور روڈ اور ریس کورس پارک کے قریب واقع ہے مجھے وہاں ایک سادہ سے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کمرے میں ٹی وی، ہیٹر اور اے سی موجود تھا۔ اندر اور باہر مسلح افراد تھے۔ مجھے ہراساں کرنے اور پریشان کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا تاکہ آنے والے دنوں کے لیے توانائی بچا کر رکھوں۔

کافی وقت گزر گیا میں خاموشی سے دل ہی دل میں اللہ کو پکارتا رہا۔ رات 9 سے 10 بجے کے درمیان دروازے پر دستک ہوئی۔ جنرل محمود، جنرل احسان اور

جنرل علی جان اورکزئی میرے کمرے میں وارد ہوئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے مجھے سیلوٹ کیا۔ میں حیرت سے سوچا کہ شاید ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اُس کا مداوا کرنے یہاں آئے ہیں۔ لیکن یہ میرا وہم تھا یہ خیالات چند لمحے کے لیے میرے ذہن میں آئے اور غائب ہو گئے۔ وہ سب میرے سامنے میز کے پار کرسیوں پر ہو گئے اور میرا حال احوال پوچھا۔ ابھی میں جنرل محمود کے سیلوٹ کی بازگشت سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ انہوں نے ایک فائل میرے سامنے میز پر رکھ دی جس میں چند کاغذات تھے انہوں نے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیے اور مجھے کہا کہ ان پر دستخط کر دیجیے۔ میں نے دیکھا کہ ایک صفحہ پر بطور وزیرِ اعظم میرے استعفٰی کی عبارت تحریر تھی اور دوسرے صفحہ پر اسمبلی کو تحلیل کرنے کی ایڈوائس۔

انتقالِ اقتدار کے لیے یہ آزمودہ طریقۂ واردات بروئے کار لایا گیا تھا۔ یہ دراصل دھاندلی اور دھونس کی نہایت وحشت ناک شکل تھی۔ اس کے لیے جو ہتھکنڈے آزمائے جا رہے تھے وہ رومن امپائر کے دوران شہنشاہوں کے محلات میں پنپنے والی سازشوں اور زیرِ زمین کوششوں کی یاد دلاتے تھے۔ یہ رُسل کرو کی فلم (The Gladiators) کا ایک منظر بھی تو تھا لیکن مقتدر قوتیں اسے قوم کے وسیع تر مفاد میں بلا دریغ استعمال کر رہی تھیں اور آئینِ پاکستان نوحہ کناں تھا۔ کیا کاغذات پر دستخط کرنے سے جان بچ جائے گی یا اس سے ملک میں کوئی مثبت روایت قائم ہو گی؟ کہانی کا اگلا باب کیا ہو گا؟ اس کی گرہ کشائی کرتے ہوئے نواز شریف کہتے ہیں:

”کاغذات پر درج مضمون دیکھ کر میں شدید رنج اور غصّے میں آ گیا لیکن جذبات پر قابو پاتے ہوئے جنرل محمود سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا یہ سب کچھ میں نے تو آپ کو لکھوایا نہیں اور نہ ہی کہا تھا پھر آپ نے یہ کس کی اجازت سے تحریر کیا۔ جنرل محمود یہ

سن کر خاموش ہو گئے اور دوبارہ کاغذات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''آپ کو ان کاغذات پر دستخط کرنا ہونگے اسی میں آپ کی بہتری ہے'' میں نے انکار کر دیا اس بحث و تمحیص میں کئی گھنٹے گذر گئے۔ جنرل محمود نے کئی بار وہ کاغذ میرے آگے کیے اور میں نے ہر بار کئی پیشکشوں کے باوجود اُن پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ تھکن سے میرا بدن ٹوٹ رہا تھا اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ نیند کا بھی غلبہ تھا۔ یہ تینوں جرنیل پیار اور دھمکی دونوں حربے آزماتے رہے کبھی کہتے جنرل مشرف کی طرف سے پیغام ہے کہ آپ لوگ شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ آپ سے کوئی خرابی ہو کبھی کہتے جنرل صاحب کی بات نہ ماننے سے معاملہ زیادہ بگڑ جائے گا کیونکہ آپ نے بہت سخت اقدام کیا ہے جس کے نتائج بہت ہولناک سکتے ہیں۔ میں نے کہا: ''اس سے زیادہ نامناسب انجام کیا ہوگا'' تو جنرل محمود نے کہا: ''آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے فوجی حکمرانوں کے سامنے انکار کرنے والوں کا انجام سب کو معلوم ہے'' شاید وہ ذوالفقار علی بھٹو کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ بالآخر جنرل محمود میری طرف جُھکے اور دستخط کرنے پر اصرار کیا میں نے کاغذ پرے ہٹاتے ہوئے کہا:

"Over My Dead Body"

میرا یہ جواب سن کر جنرل محمود اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا اور مجھے گھورتے ہوئے دیکھا اور کہا: ''آپ شاید اس حکم عدولی کے انجام سے آگاہ نہیں ہیں''۔ نیند نے میری آنکھوں پر بوجھ بڑھا دیا تھا میں نے اُن سے کہا:

"Please go & Let me sleep"

یہ سنتے ہی وہ غصّے میں کمرے سے نکل گئے اور دوسرے ہی لمحے دروازے کے باہر پہلے کنڈی لگنے اور پھر تالے میں چابی لگنے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی۔ پرسکون سناٹا چھا گیا میں بستر پر لیٹا اور گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اَسیری کی پہلی صُبح

13 اکتوبر 1999ء کی صُبح نواز شریف کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا سا تھا یہ اسیری کی پہلی صُبح تھی۔ کمرے کا جائزہ لیا تو آنکھوں میں شدید درد نے انگڑائی لی۔ یہ گزشتہ رات کے تناؤ اور تادیر جاگنے کی وجہ سے تھا خاموش کمرے کی نیم تاریکی سے انہوں نے سمجھا کہ ابھی صبح کاذب ہے اس لیے نماز فجر ادا کر لی جائے نماز کی ادائیگی اُن کی جبلت کا حصّہ ہے۔ اپنے والد سے حاصل کی ہوئی یہی تربیت انہوں نے اپنی اولاد کو بھی منتقل کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے صاحبزادے حسین نواز، حسن نواز اور بچیاں سب نماز کی عادی ہیں۔ حسین نواز نے تو قرآن مجید کی قرآت کے ساتھ ساتھ خوش الحانی سے نعتِ رسول مقبول ﷺ پڑھنا بھی سیکھ لیا ہے۔ اُن کا ترتیل سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور اُردو زبان کے ممتاز نعت گو شاعروں کا کلام پڑھنا اُن کے دادا میاں محمد شریف کے دل میں گھر کر گیا اور حسین نواز میاں محمد شریف کے لاڈلے پوتے بن گئے۔ شریف خاندان، جس میں میاں محمد شریف صاحب کے سخت نظم وضبط کی پابند زندگی نے ایک مشفقانہ خوف طاری کر رکھا تھا، ایسے میں دادا کا محبوب ہونا باعث فخر تھا۔

انہی خیالات میں گھرے نواز شریف نے کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کے باوجود نماز فجر ادا کی۔ وقت کیسے بدلا تھا۔ ابھی گزشتہ سے پیوستہ رات وہ وزیراعظم ہاؤس کی آراستہ و پیراستہ خواب گاہ میں محواستراحت تھے۔ جہاں نمازِ فجر کے وقت تمام اہل خانہ نماز ادا کرتے۔ یہ عادت بھی میاں محمد شریف کا عطیہ تھی اور اب زنداں کی تنہائی میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اُن کا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ انہیں

اقتدار سے محروم کر کے ایک ملزم کی حیثیت میں قید کر لیا گیا تھا۔ یہ تو دہلی کے لال قلعے میں لکھی جانے والی کہانی کا کوئی باب معلوم ہوتا تھا جس میں ایک شہزادے نے اپنے محسن اور والد شاہ جہاں کو اقتدار سے محروم کر کے قید خانے میں ڈالا تھا جہاں وہ کئی برس قیدی کی حیثیت سے زندگی گزار کر کسمپرسی کی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اس سوچ سے جائے نماز پر بیٹھے نواز شریف کو ایک جھرجھری سی آ گئی۔

نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے نواز شریف کی نظریں معاً کھڑکی کی جانب اُٹھ گئیں۔ اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ راتوں رات کھڑکیوں کے شیشے سیاہ کر دیے گئے ہیں اور اُن پر پرانے اخبارات بھی چپکا دیے گئے ہیں اس کاروائی کا مقصد یہ تھا کہ سورج کی روشنی اندر نہ آ سکے اور نہ ہی باہر کے لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اندر کون بند ہے۔ نواز شریف دعا مانگنے کے فوراً بعد اُٹھے اور کھڑکی کی طرف لپکے باہر دیکھنے کی کوشش کی تو کچھ نظر نہ آیا باہر کے منظر میں گہری دھندلاہٹ تھی۔ اُس کے باوجود اُنہوں نے اندازہ لگا لیا کہ سورج تو کب کا طلوع ہو چکا ہے۔ تو کیا میں نے نماز فجر قضاء ادا کی ہے؟ انہوں نے اداسی سے سوچا۔ گویا ایک بڑی نعمت سے محروم ہو گئے۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑے رہے۔ خالی ذہن لیکن دل میں طوفان لیے۔ پھر بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اپنے بستر کے کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت منجمد ہو گیا ہو اور زندگی کے متحرک کاروان کے قدم رک گئے ہوں۔ خیالات میں ایک عجیب طرح کی ہلچل برپا ہو رہی تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی دروازے پر لگا تالا کھول رہا ہے۔ چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں دروازہ کھلا تو کمرہ صُبح کی روشنی میں گویا نہا گیا۔ ایک باوردی ملازم ہاتھ میں سادہ سی ٹرے لیے کھڑا تھا اُس کے ساتھ چھ بندوق بردار

تھے وہ سب دروازے پر کھڑے رہے وہ شخص کمرے میں داخل ہوا اور ٹرے میز پر رکھنے کے بعد کچھ کہے سنے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا اور دروازہ پھر مقفل کر دیا گیا۔

وزیراعظم نواز شریف نے تھکی تھکی نظروں سے میز پر رکھا ہوا سادہ ناشتہ دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُسے معدے میں اُنڈیلا پھر خاموشی سے بستر پر لیٹ گئے۔

انہیں ہلکی سی اُونگھ آئی اور چند ساعتیں اسی حالت میں گزری ہونگی کہ دروازہ پھر کھلا نواز شریف نے دیکھا ایک باوردی بریگیڈیر اندر آیا اور آتے ہی تن کر سلوٹ مارا تو وہ پھر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی اسی سوچ میں گم تھے کہ اُس بریگیڈیر کے ایک اشارے پر ایک درجن کے قریب فوجی جوان اندر داخل ہوئے اور انہوں نے نہایت سرعت کے ساتھ کمرے میں موجود تقریباً ہر چیز اُٹھالی اور کھڑکیوں پر بھاری بھرکم پردے آویزاں کر دیے۔ کمرے کا قالین، میز، کرسیاں، ٹیبل لیمپ، سائڈ ٹیبل تقریباً ہر چیز کو سمیٹ لیا گیا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ باقی رہا تھا۔ نواز شریف ورطۂ حیرت میں گم یہ منظر دیکھتے رہے، کچھ نہ بولے، کسی سے کچھ نہ کہا۔

بریگیڈیر صاحب کمرے میں ٹھہر گئے اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا انہوں نے نواز شریف کو سیلوٹ کیا اور کہا سر یہ میری ڈیوٹی ہے اور میری مجبوری بھی میں حکم کا پابند ہوں اور مجھے ایسا ہی کرنے کا احکامات ملے ہیں (Sorry Sir)۔ اُس کے بعد انہوں نے چند کاغذات اُن کے سامنے رکھ دیے۔ اُن پر تحقیق و تفتیش کے انداز میں لکھے گئے کچھ سوالات درج تھے۔ وزیراعظم نے انہیں ایک نظر دیکھا اور واپس بریگیڈیر کی طرف بڑھا دیا۔ جوابات نہ پا کر وہ تقریباً دو گھنٹے تک زبانی سوال جواب

کرتے رہے۔ اس کے بعد چلے گئے اور قید تنہائی پھر لوٹ آئی۔

پاکستان کی انتخابی تاریخ کا سب سے بھاری مینڈیٹ لینے والے وزیرِاعظم نواز شریف پابند سلاسل ہوئے اور ملزم ٹھہرے۔ کئی روز تک وہ اُس کمرے میں رہے اور وہی بریگیڈیر صاحب لگاتار آتے رہے۔ سوالات کے جوابات پر اصرار کرتے اور انکار پر لوٹ جاتے پھر اچانک انہوں نے آنا بند کردیا۔ اس کی وجہ سے تنہائی مزید بڑھ گئی۔ کھانا دینے والے خاموشی سے آتے اور کچھ ہی دیر بعد آ کر برتن لے جاتے۔

راولپنڈی کے جس میس یا آئی ۔ایس۔آئی کے سیف ہاؤس میں نواز شریف کو مقید کر کے مقتدر قوتیں اپنے مطالبات منوانے اور انہیں اپنی راہ پر لانے کی کوششیں کر رہی تھیں، وہ دن اور رات کی تمیز سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کمرے میں بند نواز شریف کو کچھ معلوم نہ ہوتا سورج کب طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ شام کب اپنے پر پھیلائے جڑواں شہروں پر اُترتی ہے اور کب رات کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کے لیے لیل و نہار یکساں ہو گئے تھے۔ انسان کی زندگی کس طرح رنگ بدلتی ہے اور پانسہ پلٹتی ہے۔ نواز شریف نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا ہوگا۔ وہ ایک کاروباری خاندان کے چشم و چراغ تھے پھر محنت، ہمت اور کوشش سے وزارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اس طرح کے حالات کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ گزشتہ وزارتِ عظمٰی کے آخری دنوں میں ایک سنگ دل صدر اور چھڑی ہلاتے ہوئے جرنیل سے واسطہ ضرور پڑا تھا لیکن اب کی بار وہ بھاری مینڈیٹ لیکر اقتدار کے ایوان میں داخل ہوئے تھے اور بظاہر ان کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔

لیکن یہ سیاہ ساعتیں ظہور میں آ چکی تھیں۔ نواز شریف جو صُبح وشام دنوں ہفتوں، گھنٹوں اور لمحوں کی قید اور تفریق سے آزاد ہو چکے تھے جب یہ سوچتے کہ اسٹیبلشمنٹ اپنے مفادات کا کس طرح تحفظ کرتی ہے اور اس کے لیے کس طرح قوم اور ملک کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے تب اُنہیں معلوم ہوتا کہ پاکستان کی بدقسمتی کی وجہ کیا ہے؟ جمہوریت کی کلی چند دنوں کے لیے مسکائی تھی لیکن غنچہ بننے سے پہلے مرجھا گئی۔ اسے لمبے اور مظبوط بوٹوں تلے مسل کر رکھ دیا گیا تھا۔ مایوسی اور نا اُمیدی کا ایک پھیلا ہوا سمندر تھا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ تہہ بہ تہہ اندھیرا تھا اور یہ اندھیرا صرف ایک انسان کا مقدر نہ تھا بلکہ سارے ملک اور اس کے عوام کا مقدر بن چکا تھا۔ کربناک خاموشی قطرہ قطرہ روح کے اندر اترتی جا رہی تھی۔ وزیراعظم کا سینہ درد سے بھر گیا تھا محشر کی گھڑیاں گزر نہیں رہی تھیں۔

This page is empty

نہ جُھکنا ہے نہ بِکنا ہے!

نواز شریف کہتے ہیں: ''نومبر کی کسی تاریخ کو مجھے اس عقوبت خانہ سے نکال کر بذریعہ کار مری منتقل کر دیا گیا۔ راولپنڈی سے جو گاڑی چلی وہ بند سی تھی کیونکہ کار کے شیشے سیاہ تھے اور اس کے اطراف میں جیپیں اور کاریں تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت خطرناک قیدی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ گاڑی نہایت غیر آرام دہ تھی۔ جان بوجھ کر ایسی گاڑی کا انتخاب کیا تھا جس سے مجھے ذہنی اور جسمانی ایذا پہنچے۔ اللہ مجھے برابر ہمت دیتا جا رہا تھا اور میں خود کو ذہنی طور پر پوری طرح سخت سے سخت مقام سے گزرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ جن لوگوں نے آئین کو پامال کیا تھا، منتخب وزیراعظم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور اب انہی کے حکم پر قید کر کے پنڈی سے مری لے جایا جا رہا تھا ان سے ہر برائی اور سختی کی توقع ممکن تھی۔ میری حکومت کا مستقبل کیا تھا یہ تو اُن کے ابتدائی دنوں کے رویے ہی سے ظاہر ہو گیا تھا، اس لیے میں نے خود کو نئے حالات وسانحات سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا۔ گاڑی کے ہچکولوں میں بے تحاشہ اضافہ ہونے لگا تو میں نے ساتھ بیٹھے بندوق بردار محافظوں سے پوچھا کہ تم لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ لیکن وہ حکم کے پابند لوگ مہر بلب تھے۔ خاموشی ہی اُن کا جواب تھا۔ میں نے اندر بیٹھے بیٹھے سر اُونچا کر کے ڈرائیور کی ونڈ سکرین سے باہر جھانکا تو علاقہ مانوس نظر آیا اور دل کو بھایا۔ یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر مخصوص قسم کی خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ گاڑی بار بار مڑ رہی تھی۔ میں نے پاکستان کے چپے چپے کو دیکھا ہے اور اسے چاہا ہے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو ہم مری کی طرف رواں ہیں۔''

سطح سمندر سے ہزاروں فٹ بلند کوہ مری میں اکتوبر کے آغاز ہی سے سردی شروع ہو جاتی ہے اور راتیں تو بہت یخ بستہ ہو جاتی ہیں دن آرام دہ ہوتا ہے مگر رات اچھے کمبل یا ہیٹر کے بغیر گزارنا دشوار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں سیاحوں کی وجہ سے مری میں رونق ہوتی ہے اور رات گئے تک بازاروں گہما گہمی رہتی ہے۔ اکتوبر میں لوگ موسم گرما گزارنے کے بعد اپنے شہروں کا رخ کرتے ہیں تو مری ویران ہو جاتا ہے اور اس پر اداسی چھا جاتی ہے۔

''میرا اندازہ درست تھا۔'' نواز شریف نے سحر انگیز داستان دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ نواز شریف زیادہ لمبی بات کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن اپنے ایامِ اسیری کی داستان بیان کرتے ہوئے وہ ساری جزئیات بیان کرتے جارہے تھے: ''میرا اندازہ درست تھا گاڑی گھنٹہ بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد مری پہنچ گئی کیونکہ سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ لوگ مجھے مری کیوں لے آئے ہیں شاید مجھے اس طریقے سے اذیت دینا چاہتے ہیں؟ میں نے زندگی کے کئی موسم مری میں گزارے ہیں اس لیے جانتا تھا کہ نومبر میں بھی مری میں خاصی سردی ہوتی ہے۔ آنے والے حالات کی نشاندہی ہو رہی تھی اور میں بھی ذہنی طور پر تیاری کر رہا تھا۔ سب کچھ سمجھ سے باہر تھا لیکن میں نے حواس کو منتشر نہ ہونے دیا کیونکہ اس سے مہلک غلطیاں ہونے کے امکانات بڑھ جاتے۔ میں بہرحال اس لحاظ سے مطمئن تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے بندوقوں والے مجھ سے ناراض تھے۔ وہ میرا آئینی حق تھا، جسے میں نے استعمال کیا تھا۔ اسے نہ تو پاکستان کی کوئی عدالت غلط قرار دے سکتی تھی اور نہ ہی کسی دوسری دنیا کی کوئی عدالت۔ آئینِ پاکستان نے مجھے بحیثیت وزیراعظم جو اختیارات تفویض کیے انہیں بروئے کار

لانا ہرگز غلطی نہیں تھی لیکن اُن کے استعمال سے بعض وردی والے متفق نہ تھے اور مجھ سے ناراض ہوگئے تھے۔ یہ دراصل بغاوت تھی۔ سرکشی اور لاقانونیت تھی اور یہ ماضی میں متعدد بار کی جاچکی تھی۔ سرکشی کرنے اور آئین کی دھجیاں اُڑانے والے افراد کو کوئی سزا نہیں دی گئی تھی، نہ ان سے پُرسش کی گئی تھی اس لیے اُن کا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ پاکستان کے منتخب حکمران اور حکومت کا نہ صرف مذاق اُڑاتے تھے بلکہ خود کو بادشاہ گر سمجھتے تھے اور سیاستدانوں کو شطرنج کے مُہروں کی طرح استعمال کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد 1988ء سے 1999ء تک ہر حکومت کا مذاق اُڑایا گیا کسی کو مدت کی تکمیل کی اجازت نہ دی گئی۔ اپنی حکمرانی اور فرعونیت قائم کرنے کے لیے یہ لوگ چھڑی ہلاتے ہوئے آتے تھے اور آئینی حکمرانوں کو رخصت کردیتے تھے...... لیکن اب میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کی کوئی بات یا مطالبہ نہیں ماننا'' خواہ کچھ بھی ہوجائے اور کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینا پڑے''۔

وزیراعظم میاں نواز شریف اَیام اسیری کے ابتدائی دنوں کی اعصاب شکن کہانی آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''مری پہنچا تو یخ ہواؤں نے استقبال کیا۔ سردی مری کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ ہم مغرب کے وقت پہنچ گئے تھے۔ سورج بلند و بالا پہاڑوں میں چھپ رہا تھا اور صرف آسمان پر شام کی گہری سرخی رہ گئی تھی۔ گاڑی سے نیچے اُتارا گیا تو مغرب کی اذانیں وادیوں میں گونج رہی تھیں۔ میں نے نماز ادا کرنا چاہی تو روک دیا گیا اور کہا کہ ابھی کاغذات کی تکمیل باقی ہے۔ اس دوران مسلح فوجیوں نے کارکو نرغے میں لیے رکھا اور میں تقریباً دس سے پندرہ منٹ کھڑا رہا۔ یہ مری کا گورنر ہاؤس تھا

مری شہر کے جس علاقے میں وزیراعظم نواز شریف کو جنرل مشرف کے حکم پر قید کیا گیا تھا اُس علاقے میں ویسے ہی خاموشی اور ویرانی کی حکمرانی رہتی ہے اس علاقے میں گورنر ہاؤس کی موجودگی اور اس کے اردگرد فوجی افسران کی رہائش گاہوں کی وجہ سے یہ ممنوعہ علاقہ ہے اور یہاں بلا اجازت آمدورفت پر پابندی ہے۔ نواز شریف کو قید کیے جانے کے بعد اسے مزید حساس علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔

نواز شریف کہہ رہے تھے: ''میں یہاں کئی بار پنجاب کے وزیراعلیٰ اور پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے آچکا تھا۔ اس کے ایک ایک کمرے اور چپے چپے سے بخوبی آگاہ تھا جب مجھے یہاں لانے والے محافظوں نے بتایا کہ کاغذات کی تکمیل ہونا باقی ہے تو مجھے شدید رنج ہوا لیکن میں خاموش رہا اور دل ہی دل میں اپنے رب سے دعا کی کہ مجھے ہمت عطا فرما اور اپنے ارادوں میں کامیاب رہنے کا حوصلہ دے''۔

کشمیر پوائنٹ پر واقع گورنر ہاؤس میں نواز شریف کو کہاں رکھا گیا؟ کیا یہ آرام دہ جگہ تھی؟ کیا وہ وزیراعظم کے شایانِ شان تھا یا ایک حقیر قید خانہ تھا یہ سوالات پاکستان کے ہر شہری کے ذہن میں اُٹھتے ہیں میرے بھی ذہن میں تھے۔ ایک روز جدّہ سرور پیلس میں مہمانوں کی تعداد خاصی کم تھی، میں نواز شریف صاحب سے یہ سوال کر بیٹھا۔ وہ سوال سن کر یکدم خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر دروازے کو دیکھتے رہے جیسے یادوں کو مجتمع کر رہے ہوں پھر کہنے لگے: ''مجھے گورنر ہاؤس کے زیریں حصّہ میں واقع ملازمین کے لیے مختص بیرک کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایک سو سال پرانہ ویران اور خستہ حال چھوٹا سا کمرہ تھا جو شاید کسی زمانے میں ادنیٰ ملازمین کے زیر استعمال تھا۔ لیکن مجھے یہاں لانے والوں نے میرے لیے

اسے ہی منتخب کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کمرہ ٹیلیفون ایکسچینج یا سٹور کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ نواز شریف وزیراعظم پاکستان اُس کمرہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں بھی کھڑکیوں اور دروازے کو بند کرنے کے علاوہ انہیں سیاہ کرنے کا مکمل انتظام کیا گیا تھا تاکہ بیرونی دنیا سے ہر طرح کا رابطہ کٹ جائے، اور یہاں تک کہ ڈیوٹی پر موجود گارڈز کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکے کہ یہاں پاکستان کے منتخب وزیراعظم کو قید رکھا گیا ہے۔ چند روز بعد لکڑی کی کھڑکیوں کے باہر لوہے کی گرل بھی لگا دی گئی۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ مجھے قید کرنے والے ہر روز اذیت دینے کا ایک نیا بہانہ دھونڈ لیتے۔ کمرے میں بہت بلند روشندان تھے جنہیں جان بوجھ کر کھلا رکھا گیا تھا وہاں سے یخ بستہ ہوائیں آتی تھیں جن سے کمرہ شدید سرد رہتا تھا۔ مجھے سنگل راڈ کا ایک ہیٹر دیا گیا تھا جس کی تپش ایک فٹ سے دور نہیں جاتی تھی اور میں حرارت حاصل کرنے کے لیے اُس کے قریب بیٹھتا تھا۔ بستر بھی گزارا ہی تھا۔ کمرے کی تنگی اور سرد ماحول نے میرے جسم کو منجمد کر دیا تھا۔ میں وہاں تقریباً ایک ماہ تک رہا۔ اس دوران مختلف فوجی آفیسر آتے تھے چہرہ اور لہجہ بدل بدل کر ایک ہی بات کرتے تھے کہ کاغذات پر دستخط کر دو میں ہر بار انکار کر دیتا تھا۔ جوں جوں میں انکار کرتا رہا، قید تنہائی بڑھتی گئی۔ سختیاں بھی بڑھتی گئیں لیکن میں اپنی جگہ رہا۔ اس دوران مجھے بالکل نہ بتایا گیا کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں گرفتار ہیں یا آزاد ہیں اُن کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا ہے میرے بھائی شہباز شریف صاحب کے بارے میں بھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں ......'' بھٹو صاحب کو قید کرنے والوں نے اُن کے ساتھ بہت مختلف سلوک روا رکھا تھا۔ مجھے قید کرنے والے مجھے ذہنی طور پر شکستہ کرنے کے لیے ہر حربہ آزما رہے تھے اللہ نے مجھے

ہمت دی اور میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ نہ جھکنا ہے اور نہ ہی بکنا ہے۔ اصولوں کی جنگ لڑنی ہے۔ ماضی میں بہت کچھ ہو چکا۔ برداشت کیا جاتا رہا گیا۔ غاصبوں کی ہر بات مان کر ملک کا مستقبل داؤ پر لگا دیا گیا لیکن اس بار میں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ آئین کی بالا دستی قائم کرنی ہے اور اُن قوتوں کی کوئی بات تسلیم نہیں کرنی جو آئین کو پامال کرنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ الحمدللہ! اللہ نے مجھے اس میں سرخرو کیا''۔

نواز شریف وزارتِ عظمیٰ سے محروم کیے جانے اور مری لے جانے کی تفصیل بیان کر رہے تھے اور میرا ذہن کہیں دور بھٹک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریخ پاکستان کے اوراق ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ یاد آ رہا تھا کہ پاکستان کے ایک اور منتخب وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو 1977ء میں تحریک مصطفیٰ کی آڑ میں معزول کر کے مری منتقل کیا گیا تھا اور مری کے گورنر ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ بعدازاں جنرل ضیاء الحق سمیت کئی طاقت ور جرنیل اُن سے اسی گورنر ہاؤس میں ملنے آئے تھے اور یہ تصاویر قومی اخبارات کی زینت بھی بنی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو یہ دلاسہ بھی دیا گیا تھا کہ چند دنوں کی بات ہے آپ پھر سے وزیر اعظم پاکستان ہوں گے لیکن کہنے اور سننے والے دونوں کو بخوبی علم تھا کہ یہ سچ نہیں ہے۔

اس کے بعد بھٹو صاحب کو ایک عدالتی ڈرامے کے ذریعے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور ایک نئی تاریخ رقم ہوگئی۔ جنرل ضیاء الحق کے قریبی اور معتمد ساتھی جنرل کے۔ایم عارف اپنی کتاب (Working with Zia) میں اپنی اس ملاقات کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں: ''بعداز دوپہر جنرل ضیاء، جنرل چشتی اور میں مری کے گورنر ہاؤس پہنچے جہاں ہم نے بھٹو صاحب کو واضح طور پر افسردہ اور پژمردہ دیکھا۔ لاؤنج

This page is empty

میں پہنچنے کے بعد جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب سے دریافت کیا کہ وہ اُن سے علیحدگی میں ملنا پسند کریں گے یا نہیں۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا جنرل چشتی کو بھی ساتھ لے آئیں۔ اس ملاقات میں بہت سے معاملات اور مسائل زیرِ بحث آئے۔ جناب بھٹو مسکرا رہے تھے لیکن اندرونی طور پر وہ خوف زدہ اور سہمے ہوئے تھے"۔

بھٹو صاحب کے برعکس نواز شریف صاحب کو مری کے قید خانے میں انہیں معزول کرنے والے شخص ملنے نہیں آئے بلکہ ان کے نمائندے آتے جاتے رہے لیکن نواز شریف کو کسی ڈیل پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔ قید تنہائی، شدید سرد موسم، ذہنی اذیت کے باوجود نواز شریف کے اعصاب نے جواب نہ دیا اور وہ اپنے موٴقف پر قائم رہے۔

''بغاوت'' کی ایف آئی آر

مری کے شب و روز دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ صبحیں و شامیں تنہائی کی زد میں تھیں۔ لمحوں کا کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ مری کے قید خانے میں نواز شریف کے لیے اُمید اور رہائی کا کوئی چراغ نہ جل سکا۔ قید کرنے والوں کی کوشش تو یہی تھی کہ انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر ماؤف کر کے شکست دی جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ نواز شریف اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اپنی جرأت اور دلیری سے قید کرنے والوں کو حیران کر دیا۔ انہیں معزول کرنے والی قوتوں کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بحران سے کیسے نمٹا جائے۔ اس کا حل کیا ہے۔ وردی والوں نے راولپنڈی اور اب مری کے زنداں خانوں میں نواز شریف سے بے شمار ملاقاتیں کر کے دیکھ لیں تھی، انہیں مراعات دینے کی پیش کش بھی کی گئی۔ انہیں بیرون ملک روانہ کرنے کا خواب بھی دکھایا گیا لیکن کوئی حربہ کامیاب نہ ہوا۔ بھاری مینڈیٹ لینے والے وزیراعظم کو برطرف کر کے ایک بہت بڑا بحران پیدا کیا جا چکا تھا اور آگے راستہ بند تھا۔ نواز شریف کو اپنی راہ پر لانے کے تمام طریقے ناکام ہو گئے تھے اب کیا کیا جائے؟

اس کا راستہ یہ نکالا گیا کہ نواز شریف پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ ایف آئی آر کاٹ دی گئی اور وہ باقاعدہ ملزم بنا دیے گئے۔ انہیں مقدمہ بھگتنے اور عدالت کا سامنا کرنے کے لیے مری سے کراچی منتقل کر دیا گیا۔ اس مقدمے کے بارے میں خود نواز شریف کیا محسوس کرتے ہیں؟ اُن کے ذاتی احساسات کیا ہیں؟ سرور پیلس ہی میں ایک روز میں نے یہ سوال بھی اُن سے کر ڈالا، اگرچہ اس سوال کی

اہمیت کا احساس مجھے بھی تھا، نواز شریف نے اس بارے میں کہا: ''یہ بے بنیاد افسانہ تھا، حقائق کے منافی پروپیگنڈہ تھا، میں نے جنرل پرویز مشرف کے جہاز کو پاکستان میں نہ اترنے کے احکام جاری نہیں کیے تھے، یہ سراسر جھوٹ تھا اور فوج کی خفیہ ایجنسیوں نے اپنے خصوصی ذرائع کی بدولت سارے ملک میں نشر کر دیا تھا۔ جنرل مشرف نے اس بنیاد پر ہمدردیاں سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ فوج کی ایجنسیاں سیاست دانوں کو بدنام کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ حالانکہ انہیں ملک دشمن قوتوں کا تعاقب کرنا چاہیے لیکن وہاں قدم قدم پر انہیں ناکامی ہوئی اور انہی کی وجہ سے کئی جنگوں میں ہمیں شرمندگی ہوئی۔ ایک جھوٹی کہانی اور افسانے کی بنیاد پر میرے خلاف ایف آئی آر کاٹ دی گئی لیکن اللہ کے فضل و کرم سے میں گھبرایا نہیں اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اس مہلک ہتھکنڈے کا بھی مقابلہ کروں گا۔''

پھر پاکستان کی عدالتوں میں وہی منظر دہرایا جانے لگا جو 1977ء سے 1979ء تک جناب ذوالفقار علی بھٹو پر قائم کیے گئے مقدمے کے حوالے سے دنیا کو دکھایا گیا تھا۔ دنیا کے معروف وکلا اور جج صاحبان نے اس مقدمہ میں بھٹو صاحب کو پھانسی کے فیصلہ کو جوڈیشل مرڈر قرار دیا تھا اور یہ آج تک ہمارے ملک اور قوم کے چہرے پر ایک داغ ہے۔ اب پاکستان کا دوسرا وزیر اعظم پابند سلاسل تھا۔ یہ کیسی بدقسمتی تھی کہ پاکستان کی مختصر سی تاریخ میں ایک وزیر اعظم کو راولپنڈی کہ لیاقت باغ میں جلسہ عام کے دوران تقریر کرتے ہوئے گولی مار کر شہید کر دیا گیا، دوسرے وزیر اعظم کو قتل کے مقدمہ میں ملوث کر کے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا اور اب تیسرے وزیر اعظم کو بغاوت کے مقدمہ کا سامنا تھا۔

پاکستان غالباً اس لحاظ سے دنیا کا منفرد ترین ملک ہوگا جہاں پچاس سالہ

تاریخ میں منتخب وزرائے اعظم کا وہ حال کیا گیا کہ عوام منہ دیکھتے رہ گئے۔ دراصل کراچی جیل پتھروں سے بنائی گئی ایک قدیم اور غلیظ عمارت ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ہندوستان بھر کے خطرناک مجرموں کو یہاں قید کیا جاتا تھا اور یہاں پر بدنام زمانہ افراد بطور جیلر تعینات کیے جاتے تھے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہد نہ صرف یہاں قید کیے گئے بلکہ ان کی پھانسی کی سزاؤں پر بھی یہیں عمل درآمد ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد دوسرے صوبوں کے قیدیوں کو بطور سزا یہاں بھیجا جاتا تھا۔ اس مقدمہ کے دوران نواز شریف کراچی جیل میں کس حال میں رکھے گئے؟ وہ عدالت میں کس طرح اور کس حالت میں لیجائے جاتے تھے؟ اُن کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی تھی اور وہ کیا سوچتے تھے؟ اس طرح کتنے ہی سوالات تھے جو میں نے اُن سے ایک روز نمازِ ظہر کے بعد پوچھ ڈالے۔ وہ حسبِ معمول تحمل سے سوال سنتے رہے جواب دیتے ہوئے اُن تلخ لمحات کا ذکر کیا اور کہا: ''کراچی جیل میں مجھے تقریباً تین ماہ رکھا گیا یہ بڑے اذیت کے دن تھے، کمرہ نہایت بری حالت میں تھا اندر سے اس کی دیواریں اور فرش بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ دروازہ آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا جس کے آگے کوئی جالی یا لکڑی کا دروازہ نہ تھا ہر وقت ریت، ہوا اور مٹی کا سامنا تھا۔ دروازے سے باہر بھی کچا اور گرد آلود فرش تھا ذرا سی تیز ہوا چلتی تو ریت اور گرد اڑ کر میرے چہرے پر پڑتی، بستر بھی گرد آلود ہو جاتا اور کوٹھری کا فرش بھی ریت سے بھر جاتا۔ ایک انتہائی سخت اور غیر آرام دہ بستر دیا گیا تھا جس پر سونا بھی ذرا مشکل کام تھا شاید مجھے ذہنی دباؤ میں لانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ رات کو حشرات الارض فرش پر رینگتے رہتے تھے اور چوہوں کی بھرمار تھی۔ شاید یہ جیل حکام کے پالتو جانور تھے۔ جیل کے عملے کا رویہ نہ اچھا تھا اور نہ ہی برا یوں لگتا تھا جیسے وہ روبوٹ ہیں اور پروگرامنگ کے مطابق کام کر

رہے ہیں۔ شام کے بعد کوٹھری میں دانستہ اندھیرا کیا جاتا تھا اور تنہائی میں یہ اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ کبھی کبھار جب چاند کی مہربان روشنی وہاں در آتی تو دل کو ایک عجیب خوشی ملتی اور ذہن کو سکون نصیب ہوتا۔ انہی خوبصورت راتوں کے دوران گئے دنوں کو یاد کرتا اور اللہ سے رحم اور مدد کی دعا کرتا۔''

انہوں نے مزید بتایا: ''میری سخت نگرانی کی جاتی تھی اور رات کے مختلف اوقات میں میری نیند خراب کرنے کے لیے مختلف حرکات کی جاتی تھیں۔ عدالت میں پیش کرنے کے لیے حفاظتی انتظامات میں مزید اضافہ کر دیا جاتا۔ کوٹھری سے لے کر گاڑی میں بٹھانے تک مجھے ہتھکڑیاں پہنائی جاتیں جو کہ بہت چھوٹی تھیں اور میرے کلائی پر نشان پڑ جاتے تھے۔ ملاقات پر بھی سخت پابندی عائد تھی۔ یہ جگہ مری سے بھی زیادہ مشکل تھی۔ جیل سے عدالت تک مجھے جس گاڑی میں لے جایا جاتا تھا وہ ایک آرمرڈ کار تھی یعنی ایک بکتر بند گاڑی جس میں ہوا یا روشنی کا بہت کم گزر تھا اور یہ اندر سے بہت تنگ بھی تھی اس میں اکٹھے ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا اور کئی بار تو سانس لینے میں بھی دشواری پیش آتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی اور بکتر بند گاڑیوں جیپوں اور ٹرکوں پر مشتمل قافلہ مجھے عدالت تک لے جاتا تھا۔ راستے میں اور خصوصاً عدالت سے باہر عوام کا نعرے لگاتا ہوا جم غفیر دیکھتا تو دل کو اطمینان ہوتا کہ لوگ مجھ سے اب بھی پیار کرتے ہیں اور کئی بار تو نعرہ لگاتے ہوئے افراد میری بکتر بند گاڑی کے آگے آ کر پھول کی پتیاں نچھاور کرتے اور مسلم لیگ کی خواتین ورکرز گاڑیوں کے آگے لیٹ جاتیں۔ جس سے قافلہ رک جاتا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے لاٹھی چارج کر کے راستہ صاف کرتے اور پھر یہ قافلہ سوئے عدالت رواں ہو جاتا اس سے مجھے حوصلہ ملتا اور یہ پیغام بھی ملتا کہ لوگ اب بھی اپنے مظلوم وزیر اعظم سے پیار کرتے

ہیں۔ عوام کے ان جذبوں کو دیکھ کر میں سوچتا کہ یہ زندان خانے اور سختیاں کٹ جائیں گی۔ عوام کو دیکھ کر میں اپنی انگلیوں سے (V) یعنی وکٹری کا نشان بناتا اور یہی میرا میرے عوام کے ساتھ واحد رابطہ تھا۔ 12 اکتوبر 1999ء سے اب تک میں صرف اشاروں سے انہیں فتح کا پیغام دیتا اور اُن کے چہروں پر خوشی پھیل جاتی۔ مجھے عوام سے دور رکھنے کی سازش بھی ناکام ہوگئی تھی اور فوجی حکمران عوام کے دلوں میں جگہ نہ بنا سکے تھے۔ میری اسیری بہت مشکل بنا دی گئی تھی لیکن میں نااُمید نہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ ظلم کے یہ دن اور رات کٹ جائیں گے اور آزادی کی صبح پورے عزم کے ساتھ طلوع ہوگی۔ کراچی عدالت میں پیشی کے دوران پولیس کے ملازمین کا رویہ میرے ساتھ اچھا تھا مگر رینجرز اور آرمی کے افسران سخت رویہ اختیار کرتے تھے۔ فوج اور رینجرز کے سپاہی مجھے دیکھ کر مسکراتے اور سلام کرتے تھے۔''

This page is empty

اٹک قلعے سے کراچی کی عدالت میں پیشی

حکمرانوں نے جناب نواز شریف کو تکلیف اور اذیت پہنچانے کا ایک نیا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ قید تو اٹک کے قلعے میں کیے گئے تھے لیکن انہیں مقدمہ کا سامنا کرنے کے لیے کراچی لے جایا جاتا تھا۔ یہ ایک اذیت ناک سفر ہوتا۔ جو بہت سے مصائب کا باعث بنتا۔ نواز شریف اس جانکن سفر کی رُوداد سناتے ہوئے کہتے ہیں: ''مجھے ہر تاریخ پر بکتر بند گاڑی میں بیٹھا کر سخت حفاظتی انتظامات میں اٹک قلعہ سے راولپنڈی کے فوجی ہوائی اڈے پر لے جایا جاتا۔ وہاں ایک چھوٹا سا فوجی ہوائی جہاز میرا منتظر ہوتا جو اپنے سائز اور حجم کے اعتبار سے سیسنا طیارے کی طرح تھا اور اس پر پروپیلر یعنی پروں والے دو انجن نصب تھے۔ بکتر بند گاڑی اُس کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی ایک فوجی افسر کے حکم پر سینکڑوں مسلح افراد کے حصار میں مجھے گاڑی سے نکالا جاتا اور اس طرح اُس فوجی جہاز میں بٹھاتے کہ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر اُسے سیٹ کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ یہ بڑا تکلیف دہ تھا اور میں نے اس کے خلاف کئی بار احتجاج بھی کیا لیکن سنی ان سنی کر دی گئی اور یہ سلوک مسلسل ہوتا رہا۔ ویسے تو راولپنڈی سے کراچی تک کا سفر بذریعہ جہاز تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ لیکن مجھے زیادہ سے زیادہ تکلیف دینے کے لیے اس جہاز کے ذریعے سات گھنٹوں میں کراچی پہنچایا جاتا۔ یہ جہاز چھوٹا سا تھا اس کی رفتار بھی بہت کم تھی اور اسے تیل بھروانے کے لیے راستہ میں ملتان بھی اترنا پڑتا تھا اور اس کے لیے ہمارا قیام ملتان میں تقریباً آدھ گھنٹہ ہوتا اس دوران میں میں جہاز میں ہی بیٹھا رہتا اور اُس وقت بھی مسلح محافظوں نے گھیرے میں لیا ہوتا تھا اور ایجنسیوں کے افراد بڑی تعداد

میں موجود ہوتے تھے وائرلیس اور ٹیلیفون کے ذریعے لمحے لمحے کی خبر اوپر بھیج رہے ہوتے تھے۔"

نواز شریف کو درمیان میں جیسے کچھ یاد آ گیا تھا وہ اپنی بات کو ادھورا چھوڑتے ہوئے بولے: "اٹک قلعہ میں بیگم کلثوم نواز صاحبہ کو ملاقات کی اجازت مل گئی تھی وہ جب بھی ملنے تشریف لاتی تھیں تو ہماری ملاقات کے دوران مختلف افراد نگرانی کرتے رہتے تھے اور شاید وہاں پر کچھ الیکٹرونک آلات بھی نصب کیے گئے تھے تاکہ ہماری گفتگو سنی جا سکے یہ بہت ہی غیر اخلاقی حرکت تھی۔"

نواز شریف نے بتایا: "اٹک قلعہ کے چاروں اطراف میں مشین گنیں اور اینٹی ایئر کرافٹ گنیں بھی نصب کر دی تھیں۔ شاید اُن کے خیال میں کوئی ہیلی کاپٹر اس قلعہ پر حملہ آور ہو کر مجھے لے جا سکتا تھا بہر حال یہ سب مجھے دہشت زدہ کرنے کی کوششیں تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ یہ وقت افراد اور قومی سرمایہ کا ضیاع ہے میری حفاظت کے بہانے قومی سرمایہ ضائع کیا جا رہا تھا پاکستان کے غریب لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر فوج کو اسلحہ سے لیس کرتے ہیں تاکہ وہ دشمن سے نبرد آزما ہو سکے لیکن وہ انہی بندوقوں سے ملک کے منتخب وزیراعظم کو ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا۔"

میاں نواز شریف کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا تھا اُن کے سپید چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی وہ پھر بولے: "مجھے فوجی جہاز میں ہتھکڑی لگا کر سات گھنٹوں میں کراچی پہنچایا جاتا تھا یہ انتہائی غیر انسانی سلوک تھا۔ لیکن جہاز کا پائلٹ، جو خود بھی ایک خوبرو فوجی افسر تھا، بہت نفیس انسان تھا۔ اُس کی آنکھوں سے محبت اور احترام ٹپکتا تھا اُس کا مجھ سے رویہ بہت بہتر اور مناسب تھا۔ ہم دونوں کا ساتھ چودہ گھنٹے رہتا۔

اُس کا مسکراتا ہوا چہرا بھی غنیمت تھا۔ وہ میری ہتھکڑیاں تو کھول نہیں سکتا تھا لیکن آنکھوں آنکھوں میں محبت کا وہ پیغام دے دیتا تھا جس میں ہمدردی جھلکتی تھی۔ میں جب پہلی بار اٹک قلعے سے کراچی کی عدالت میں لے جایا گیا تو کئی عزیزوں اور خاندان کے افراد سے پہلی بار ملا۔ جس سے مجھے تقویت ملی''

ان یادوں کو دہراتے ہوئے میاں نواز شریف نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا جو انتہائی شرم ناک بھی ہے اور سنگین بھی۔ میاں صاحب کہنے لگے: ''جہاز میں مجھے ہتھکڑیاں لگانے کی بازگشت قومی میڈیا میں سنائی دینے لگی تھی اور یہ گونج عدالت تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس زیادتی کا ذکر اپنے وکیل خواجہ نوید سے کیا تو وہ سخت برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے عدالت کے روبرو اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جج صاحب سے کہا جناب عالی اگر خدانخواستہ جہاز سفر کے دوران حادثے کا شکار ہو جائے تو ہتھکڑیاں لگے میرے مؤکل کو کیسے نکالا جائے گا اور اُن کی جان کیسے بچائی جائے گی ایسا ہوا تو اس کی تمام ذمہ داری عدالت اور حکومت پر عائد ہوگی۔ یہ بات سن کر جج صاحب بھی مسکرا دیے اور میں بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔''

This page is empty

اٹک قلعہ کی خوفناک جیل

پاکستان کے ایک منتخب وزیراعظم کو وزارتِ عظمٰی سے معزول کرنے والوں نے شاید یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ نواز شریف کو ہر طرح سے ٹارچر کریں گے۔ انہیں باری باری پاکستان کی اُن جیلوں میں قید رکھا جا رہا تھا جہاں خطرناک مجرموں کو رکھا جاتا ہے۔ لیکن وہ جہاں بھی گئے، جس جگہ بھی رکھے گئے، اُن سے محبت کرنے والے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ یہ بات حکمرانوں کے مزاج پر سخت گراں گزرتی تھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ نواز شریف کو ایسی جگہ میں رکھا جائے جہاں اُن کے چاہنے والوں کی رسائی ناممکن ہو۔ اس کے لیے اٹک قلعہ میں واقع جیل کا انتخاب کیا گیا۔ یہ بدنام زمانہ قلعہ پاکستان بننے کے بعد افواج پاکستان کے حوالے ہو گیا تھا۔ لیکن مختلف حکومتوں کے دوران سیاسی اور غیر سیاسی افراد کو یہاں پر قید کیا جاتا رہا۔ یہ قدیم اور کُہنہ عمارت جبر و تشدد کی علامت بن گئی ہے۔ نواز شریف کو کراچی جیل سے ایک مقصد کے تحت یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ اُن کے آہنی اعصاب کو توڑا جائے ان پر نفسیاتی غلبہ حاصل کیا جائے اور من مانے نتائج حاصل کیے جائیں۔ لیکن وہ ناقابل تسخیر رہے۔

راولپنڈی سے پشاور کی طرف سفر کریں تو حسن ابدال اور مانکر کیمپ عبور کرتے ہی دریائے اٹک آ جاتا ہے جس کے پار صوبہ سرحد واقع ہے اس دریا کے پل سے ذرا پہلے بائیں جانب ایک پہاڑ پر قدیم قلعہ کی فصیل نظر آتی ہے۔ یہ قلعہ خودرو پہاڑی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان ایستادہ ہے اور یہی اٹک کا قلعہ ہے۔ جنگی اعتبار سے مناسب ترین جگہ پر واقع ہے۔ اس قلعہ کی دیواریں نیچے دریا تک

اُترتی چلی گئی ہیں۔ اگر کوئی یہاں سے فرار ہونا چاہے تو اسے کئی بار سوچنا ہوگا۔ سیاحتی اعتبار سے دیکھا جائے تو اٹک قلعہ بڑی اچھی اور خوبصورت جگہ پر ہے لیکن اس وحشت ناک اور دہشت انگیز قلعہ کو دیکھ کر سیاحت کی نہیں، جان کی فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مغلوں کا تعمیر کردہ یہ قلعہ اپنی نظیر آپ ہے اس کی تاریخ بہت دلچسپ بھی ہے اور خون رنگ بھی۔ اس پُرجلال عمارت نے بہت سے طوفان دیکھے ہیں۔ اگر اس کے درودیوار کو بولنے کا اذن مل جائے تو شاید اس کی سنائی گئی داستان سننے کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے۔ مغلیہ تاریخ کے سب سے بڑے فرمانروا جلال الدین اکبر، جسے خود کو "اکبر اعظم" اور "مہابلی" کہلوانے کا بہت شوق تھا نے قلعہ اٹک تعمیر کروایا۔ اکبری دور میں دریائے اٹک پنجاب کی سرحد کہلاتا تھا دریا کے پار کا علاقہ پھیلتا ہوا کابل تک چلا گیا تھا اور یہ صوبہ کابل کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ 1561ء میں اکبر بادشاہ نے پنجاب پر اپنی گرفت مظبوط کر لی لیکن کابل اس کے قبضے میں نہیں آرہا تھا۔ وہاں کا حاکم اکبر بادشاہ کا سوتیلا بھائی مرزا محمد حکیم تھا۔ اُس نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا جس سے اکبر کو پریشانی اور خوف لاحق تھا۔ اگست 1580ء میں اکبر اور مرزا محمد حکیم کے درمیان ایک خوفناک جنگ ہوئی جس میں مرزا محمد حکیم فرار ہو گیا بعدازاں گرفتار ہوا اور اسے دریائے اٹک پر پھانسی دے دی گئی۔ اُس کی لاش کئی ماہ تک وہیں لٹکتی رہی تاکہ باغیوں کو عبرت ہو۔ 1581ء میں جلال الدین اکبر پورے جاہ وجلال اور حشمت کے ساتھ کابل میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا اور کابل بھی اُس کی قلم رو میں شامل ہو گیا۔

جلال الدین اکبر فتح کابل کے بعد اپنی راجدھانی دہلی کی طرف لوٹا تو دریائے اٹک پر اٹک گیا۔ تاریخ دان کہتے ہیں کہ وہ کئی روز یہیں مقیم رہا اور دریائے

اٹک کے گردونواح کا جائزہ لیتا رہا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ عالم پناہ سے پوچھے کہ وہ کس بات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ آخرایک روز یہ حقیقت اُس وقت کھلی جب اکبر اعظم نے حکم دیا کہ دریائے اٹک کے بائیں کنارے پرایک عظیم الشان اور مظبوط قلعہ تعمیر کیا جائے۔ اکبراعظم نے مصاحبین اور وزراء سے کہا: ''یہ قلعہ مستقبل میں برپا ہونے والی اُن تمام بغاوتوں کے سامنے ایک مضبوط بند ثابت ہوگا جن کا مرکز ومحور کابل ہے۔'' اکبر بادشاہ نے سلطنت مغلیہ کے باغیوں کے خلاف بند باندھنے کے لیے اٹک قلعہ تعمیر کروایا تھا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ پاکستان بننے کے بعد منتخب وزیر اعظم کو باغی قرار دے کر اسی قلعہ میں قید کیا جائے گا اور مقدمہ چلایا جائے گا۔

مغل شہنشاہ کے حکم پر دریائے اٹک کے بائیں کنارے تیزی سے قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ ایک پرتگیزی سیاح انٹونیٹی مانٹسیریٹ (Antonte Montserrate) نے جو اس سفر میں اکبر کے ساتھ تھا اس قلعہ کی تعمیر کی کہانی بڑی صراحت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر دو سال دو ماہ میں مکمل ہوئی۔ اکبر نے اس کا نام ''اٹک بنارس'' رکھا۔ اس سے قبل وہ اپنی سلطنت کے دوسرے کونے پر ''کٹک بنارس'' کے نام سے ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کرواچکا تھا۔ اٹک قلعہ کی مختصر سی تاریخ کا احوال اسی قلعہ کے لاہوری دروازے کے دائیں جانب نصب سنگِ سیاہ کی ایک تختی پر بھی رقم ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ تختی ابتدا میں یہاں نصب نہیں تھی۔

قلعہ اٹک کے سامنے دریا کے آر پار جانے کے لیے اکبراعظم کے حکم سے قلعہ کے عین نیچے دریا کے کنارے ملاحوں کی ایک بستی آباد کی گئی جسے ملاحِ تولہ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ سارے ملاح جنوبی ہندوستان سے لائے گئے تھے اور آباد کیے گئے

تھے۔ اُن کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اُن کے نام ایک جاگیر بھی عطا کی گئی تھی تاکہ وہ کسی حکمران کے دستِ نگر نہ رہیں۔ جیسے جیسے حکمران بدلتے گئے زمانہ گزرتا گیا۔ قلعہ اٹک کی ھئیت، شکل، رقبہ اور نقشہ بھی تبدیل ہوتا گیا۔ 1812ء میں سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے اس پر حملہ کردیا اور اسے کابل کے گورنر سے چھین کر اس پر اپنی حکمرانی قائم کردی۔ سکھ حکمرانوں نے دس برس تک اس قلعہ پر قبضہ برقرار رکھا اور اُن کی فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ 1822ء کے قریب انگریزوں اور سکھوں میں ایک خونریز اور تاریخی معرکہ ہوا۔ سکھ فوج بے جگری سے لڑی۔ انگریز کمانڈر لیفٹینینٹ ہربرٹ مارا گیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمان جنگجو کماندار سعداللہ خان بھی شکست کھا گیا اور سکھوں کی قید میں چلا گیا۔ ایک برس بعد اسی جگہ دوبارہ جنگ ہوئی انگریز جیت گئے انہوں نے اٹک قلعہ پر قبضہ کرلیا اور سعداللہ خان کو بھی سکھوں کی قید سے رہا کرالیا۔ انگریزوں نے سعداللہ خان کو اُس کی بہادری اور وفاداری کے عوض بہت بڑی جاگیر عطا کی اور سند فاخرہ سے نوازا جو آگے چل کر اس کے خاندان کے لیے کامیابی و کامرانی کی کنجی ثابت ہوئی۔ 1904ء سے 1917ء تک انگریزوں نے قلعہ اٹک میں ایک مختصر سی چھاؤنی بنائے رکھی۔

ہمیں اٹک قلعہ کی جو موجودہ عمارت نظر آتی ہے یہ دراصل کئی عمارتوں پر قائم کی گئی ہے جس طرح لاہور کے شاہی قلعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی موجودہ عمارت کے نیچے بھی بہت سے قلعوں کے کھنڈرات موجود ہیں یہی کہانی اٹک قلعہ کے بارے میں بھی مشہور ہے۔ اس قلعہ کے دو دروازے بہت مشہور اور تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک لاہوری دروازہ کہلاتا ہے اور دوسرا دہلی دروازہ کہلاتا ہے۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہوں تو شاہی حمام کے منہدم آثار واضح طور پر دیکھے جا

سکتے ہیں۔ ان حماموں کے فرش کھو کھلے رکھے گئے تھے تاکہ وہاں گرم ہوا کا گزر ہو سکے جو غسل لینے والوں کو فرحت اور آرام بخش ہوتی ہوگی۔ ان حماموں کے شمال میں لاہوری دروازہ ہے جس کے اندر انگریزوں نے 1857ء کے قریب بارود خانہ تعمیر کروایا تھا۔ تفصیل کے مطابق اس بارود خانے کی تعمیر میں اُس زمانے میں 18112 روپے خرچ آئے تھے۔ بارود خانے سے اوپر جائیں تو ایک دیوار پر اکبر اعظم کی تعریف و توصیف اور عظمت کندہ کی گئی ہے۔ جس میں اکبر اعظم خود کو ''دین الٰہی'' کا بانی اور پیروکار ثابت کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ قلعہ کا تیسرا دروازہ ملاحِ تولہ کے نام سے معروف ہے جو ملاحوں کی بستی کی طرف جاتا ہے اس دروازے کے ساتھ ہی ''آبی دروازہ'' بھی ہے۔ جو اب منہدم ہو چکا ہے۔ قلعہ کی وہ فصیل جو دریا کی جانب واقع ہے اُس کی لمبائی ایک دور میں چار کلومیٹر کے برابر تھی۔ مغل شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دور میں اٹک قلعے کے ساتھ ایک سرائے بھی تعمیر کروائی تھی جو آج بھی جی۔ٹی۔ روڈ کے دائیں جانب نظر آتی ہے اور یہ پولیس اور مچھلی فروش دوکان داروں کے استعمال میں ہے۔

اکبر اعظم نے اپنے دور میں اٹک دریا کو پار کرنے کے لیے خصوصی کشتی سروس فراہم کی تھی جو قلعہ اور دریا کے پار خیر آباد کے علاقے کے درمیان چلتی تھی۔ یہ آبی راستہ بہت خطرناک تھا کیونکہ دریا کے اس حصہ میں دریائے سندھ اور دریائے کابل آ کر ملتے ہیں اور دو رنگوں کا حسین امتزاج بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں خطرناک بھنور پیدا ہوتے ہیں صرف ملاح تولہ کی بستی میں بسنے والے پیشہ ور اور تجربہ کار ملاح ہی کشتی رانی کر سکتے تھے۔ خیر آباد کی بستی آج بھی موجود ہے۔ دریا کا وہ حصہ جہاں دونوں مذکورہ بالا دریا آ کر ملتے ہیں اس کے مقابل دو بڑے بڑے پتھر

چٹانوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ انہیں ''کمالیہ'' اور ''جلالیہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ نام دراصل اکبر کے زمانے میں ''روشنائی'' فرقے کے بانی کے دو بیٹوں جلال الدین اور کمال الدین کی یاد میں موسوم کیے گئے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے اکبر اعظم کے وضع کردہ دین الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اسی پاداش میں اکبر بادشاہ نے انہیں دریا کے وسط میں اُسی جگہ لے جا کر قتل کر دیا تھا۔

اٹک قلعہ کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بنیادوں میں نفرت، حقارت اور انتقام کی آگ رکھی گئی ہے۔ انگریز سامراج نے برصغیر پر قبضہ کیا تو اپنے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے مجاہدوں کو اسی قلعہ میں مہمان بنا کہ بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا آزادی کے متوالوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا گیا۔ صدیوں بعد نواز شریف کو قیدی بنا کر اس قلعہ میں لایا گیا تو اُس کا مقصد بھی یہ تھا کہ جمہوریت کی آواز کو دبا دیا جائے۔ ملک کے اندر ہر وہ شخص، ادارہ یا گروہ جس نے کبھی اسٹیبلشمنٹ کی طاقت کو للکارا اسے سبق سکھانے کے لیے یا تو لاہور کا شاہی قلعہ استعمال کیا گیا یا اسے اٹک قلعہ میں پابند سلاسل کیا گیا۔ آج کا قیدی اس اعتبار سے منفرد ترین تھا جس نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور طاغوتی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا اور یہ نعرہ مستانہ لگایا کہ ملک کے عوام کو ظالم کی گرفت اور شکنجے سے آزاد کرایا جائے گا۔ نواز شریف کا یہ نعرہ عوام میں مقبول ہو گیا تھا اور وہ اٹک قلعہ میں قید ہو کر تاریخ کا ایک نیا اور جرأت سے بھرپور باب رقم کر رہے تھے۔ تمام تر دباؤ، ظلم اور لالچ کے باوجود وہ صرف ایک ہی بات پر مصر تھے کہ جمہوریت بحال کی جائے۔ فوج بیرکس میں چلی جائے۔

نواز شریف کو کراچی سے اٹک کیسے لایا جاتا تھا اور وہاں پر اُن سے کیسا

سلوک کیا جاتا تھا؟ نواز شریف نے اس کے جواب میں کہا: ''کراچی سے چھوٹے جہاز میں ہتھکڑیاں لگا کر راولپنڈی اور پھر بکتر بند گاڑی کے ذریعے اٹک پہنچتا اور وہاں پر مجھے ایک چھوٹے تاریک کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ یہ کمرہ بہت گرم تھا اور لوہے کی چارپائی اور اس پر ایک باریک دری میری متاع تھی۔ پنکھا بھی سست رفتار تھا اور بلب کی روشنی بھی مدہم تھی۔ جیل کے لوگ رات کے بعض اوقات میں میرا کمرہ تیز روشنیوں سے منور کر دیتے تھے کمرے کے اردگرد کئی کیمرے اور دیگر الیکٹرونک آلات بھی نصب تھے۔ اٹک قلعہ میں جو کوٹھری مجھے دی گئی تھی اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے والے بہادر سپوت یہاں کیسے تلخ ایام گزارتے تھے۔ مجھ پر سخت پابندیاں عائد تھیں اور پہرہ داروں کے کئی حصار بھی قائم کیے گئے تھے۔ کمانڈوز، آئی ایس آئی، ایم آئی اور دیگر اداروں کے پہرہ دار ہر وقت میرے گرد موجود رہتے تھے۔ کمرے کے باہر درختوں پر سانپ لٹکا دیے جاتے تھے تاکہ میں خوفزدہ ہو جاؤں۔ اس کے علاوہ کمرے کے اردگرد بچھو اور دیگر کیڑے مکوڑے کافی تعداد میں موجود رہتے تھے۔'' میاں صاحب نے چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ لب کشائی کی اور کہا: ''مجھے اس چھوٹے سے کمرے سے روزانہ نصف گھنٹے کے لیے باہر نکالا جاتا تھا اور چہل قدمی کی اجازت دی جاتی تھی۔ اس دوران بھی مسلح کمانڈوز میرے اردگرد موجود رہتے کچھ دنوں بعد میں اُن سے اور وہ مجھ سے مانوس ہو گئے اور ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہو جاتی۔ جوان مجھ سے بات چیت کر لیتے۔ حال احوال پوچھتے اور پھر دبی زبان میں کہتے ہمیں آپ سے پیار اور ہمدردی ہے ہمیں معلوم ہے کہ آپ سے زیادتی ہو رہی ہے لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ فوجی ڈسپلن کے پابند ہیں۔ اکثر مجھ سے رکھے گئے سلوک پر برہم تھے اور کہتے تھے کہ ہم

شرمندہ ہیں اور بے بس بھی۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے خبریں بھی فراہم کرنے لگے اور مجھ پر احسان بھی کیے موقع ملا تو میں اُن کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔''

گفتگو کے دوران نواز شریف نے ایک حیرت انگیز واقعہ سنایا کہنے لگے:

''مجھ پر تعینات کیے گئے جوان کافی مہربان ہوگئے تھے۔ اُن کی میرے ساتھ ہمدردیاں بڑھ گئی تھیں ایک روز تو انہوں نے محبت کی انتہا کردی اور مجھے عجیب پیش کش کردی اُن کی تعداد تین یا چار تھی وہ مجھے کہہ رہے تھے سر اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو اس قلعہ کی قید سے نجات دلا سکتے ہیں میں نے پوچھا وہ کیسے؟ وہ بولے ہم آپ کو یہاں سے فرار کروادیں گے۔ میں یہ پیش کش سن کر سناٹے میں آ گیا جس وقت انہوں نے مجھے یہ بات کہی اُس وقت بھی میں نصف گھنٹہ کے لیے چہل قدمی کررہا تھا اُن کے الفاظ سن کر میرے قدم اچانک رک سے گئے بات ہی ایسی تھی میں نے اُن سے پوچھا آپ مجھے کیسے فرار کروائیں گے اور کدھر لے جائیں گے؟ کہنے لگے یہ ہمارا کام ہے ہم کسی بھی دروازے یا دریائے اٹک کے ذریعے یہ کام کریں گے اور آپ کو یہاں سے افغانستان بارڈر تک چھوڑ آئیں گے اور آپ کی مرضی جہاں چاہیں چلے جائیں میں نے اُن سے کہا: ''میں آپ کی اس ہمدردی اور جرأت کا شکر گزار ہوں لیکن میں ملک کا وزیراعظم ہوں میں یہاں سے فرار نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس ملک کی خدمت کی ہے یہاں قانون کے نفاذ اور آئین کی عملداری کے لیے جدوجہد کی ہے میں یہ اقدام نہیں کرسکتا کیونکہ مجھے ہر شخص جانتا ہے یہ درست ہے کہ مجھے ناجائز طور پر یہاں رکھا گیا ہے اور یہ انصاف کا خون ہے۔ میں انشاء اللہ یہ ثابت کروں گا کہ میں بے گناہ ہوں اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا جن لوگوں نے مجھے جیل کا باسی بنایا ہے انہوں نے غیر قانونی، غیر آئینی اور غیر اخلاقی حرکت کی ہے میں انہیں

آئین اور قانون کی طاقت سے شکست دوں گا مجھے اس ملک کی مٹی نے عزت اور شرف بخشا ہے مجھے اس سے پیار ہے میں اس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا اور اس مٹی کے وقار اور حرمت کے لیے ہر اقدام کروں گا۔ فرار ہونے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔"

نواز شریف نے بتایا: "بیگم کلثوم نواز صاحبہ کی بھرپور کوششوں اور پارٹی کے بہادر لیڈروں کی جدوجہد کی بدولت مجھے گھر سے کھانا منگوانے کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ بیگم صاحبہ کھانا تیار کروا کر بھیج دیتی تھیں فروٹ اور سوئٹ ڈش بھی آ جاتی تھی لیکن افسوس ہے کہ قلعہ میں موجود آئی ایس آئی کے افسران اُس کھانے کو چیک کرنے کے بہانے غائب کر دیتے تھے یا اُس کی فراہمی میں تاخیر کر دیتے تھے تا کہ کھانے کی حالت خراب ہو جائے میں اس وجہ سے کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔"

اس قلعہ کی اسیری کے دوران جنرل مشرف اُن سے سودے بازی کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ چند کاغذوں پر دستخط کے عوض رہائی کا وعدہ بھی کیا جا رہا تھا بعض مؤثر لوگوں کو بھی بطور پیامبر استعمال کیا جا رہا تھا۔ نواز شریف نے کہا: "میں نے ہر قدم پر سودے بازی سے انکار کیا۔ زندگی بہت تلخ اور عذاب ناک تھی لیکن بہر حال تاریخ تو ضرور رقم ہو رہی تھی۔ چہرے بے نقاب ہو رہے تھے۔ نیتیں بے حجاب ہو رہی تھیں۔ لالچی ننگے ہو رہے تھے۔ غدار عیاں ہو رہے تھے۔ دوست دوستی کا حق ادا کر رہے تھے مجھے معلوم تھا کہ عوام کی طاقت میرے ساتھ ہے۔ ہر بار جب بھی وہ میرے پاس سودے بازی کے لیے آتے میں اُن کی ہر پیش کش مسترد کر دیتا۔

This page is empty

طیارہ اغوا کیس میں سزا اور اٹک میں اسیری

فوجی حکمرانوں نے جناب نواز شریف کا تختہ اُلٹنے کے بعد کئی ماہ تک انہیں دباؤ اور قید کے سخت مراحل سے گزارا۔ سارے ملک میں اس بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ نواز شریف اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ بیگم کلثوم نواز کے ملک گیر دورے اور آتشیں بیانات باوردی حکمرانوں کی نیند حرام کر رہے تھے۔ اخبارات کے تجزیے بھی حکومت کو پریشان کیے ہوئے تھے۔ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایک انتہائی سنگین قدم اُٹھالیا تھا لیکن اس کے دور رس نتائج سے پریشان لگ رہے تھے۔ ملک بھر میں پھیلا ہوا یہ احساس وبالِ جان بن رہا تھا کہ ایک منتخب وزیراعظم کو پھانسی دی گئی تھی اور اب ایک دوسرے منتخب وزیراعظم کو معزول کر کے موت وحیات کی کشمکش سے گزارا جا رہا ہے اور انہیں طیارہ اغوا جیسے جھوٹے مقدمہ میں عمر قید کی سزا سنادی گئی تھی جس پر تمام ممالک نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ ملکی اخبارات پر تو سینسر نافذ کیا جا سکتا ہے لیکن بین الاقوامی اخبارات اور ٹی وی چینلز کھلے عام تنقید کر رہے تھے۔ ملک میں پریس پر پابندی سے عوام الناس کے جذبات و خیالات قید تو نہیں کیے جا سکتے۔

حکومت کے خفیہ اداروں کے پاس بے پناہ وسائل اور ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ قومی خیالات واحساسات کی رپورٹیں حکمرانوں تک پہنچاتے ہیں۔ نواز شریف کے حق میں احساسات کے پھیلتے ہوئے دائروں کا ادراک کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف اور خفیہ اداروں نے نواز شریف کو رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اسیری کے دن اپنے اختتام کو پہنچ رہے تھے لیکن نواز شریف اُس سے بے خبر اٹک کے خوفناک

قلعے میں مشکل ترین شب و روز گزار رہے تھے۔ یہ ایک پراسرار سا سوال ہے کہ نواز شریف کو قلعہ اٹک سے رہائی کیسے ملی؟ کون یہ پیغام لے کر آیا تھا؟ اس وقت اچانک جب اس پیغام کے الفاظ سنے تو میاں صاحب کے احساسات کیا تھے؟

میں نے یہ سوالات نواز شریف صاحب کے سامنے رکھے تو وہ مسکرا دیے۔ اُس روز جواب ٹال گئے تھے۔ شاید وہ ان نامہربان اور پرعذاب لمحوں کو یاد نہیں کرنا چاہتے تھے میں نے بھی اصرار نہ کیا۔ لیکن یہ سوالات میرے دماغ میں موجود رہے اور پھر کئی ماہ بعد ایک اور ملاقات میں میں نے یہ سوالات پھر اُن کے سامنے رکھ دیے۔ وہ مسکرائے اور یوں لگا جیسے وہ میرے جواب دینے کے منتظر تھے۔ یادوں کے جھروکے میں جھانکا اور بولے: ''اٹک کے قلعے میں سردی بڑھ گئی تھی۔ یہ سردی بھی موسم گرما کی طرح عذاب سے کم نہ تھی۔ یہ قلعہ سطح زمین سے کافی بلند ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل آزادی کی جنگ لڑنے والے متوالوں کو یہاں پر قید کیا جاتا تھا۔ ملک بننے کے بعد بھی یہ روائت قائم رہی اس کے ایک طرف دریائے اٹک کا یخ پانی بہتا ہے اور دوسری طرف بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ ہے اس لیے موسم خاصا درشت ہے۔ میری کوٹھڑی کے دروازے دانستہ کھلے رکھے جاتے تھے اور مجھے شدید سرد ہوا کا سامنا رہتا تھا۔ رات کے وقت سردی بہت بڑھ جاتی تھی۔ مجھے کمبل کے نام پر جو چیز دی گئی تھی وہ اس سردی کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ میں نے جیل حکام سے کوئی درخواست نہ کی۔ ایک دن بعد بیگم کلثوم نواز کمبل جیل حکام کے حوالے کر گئی تھیں لیکن مجھ تک نہ پہنچنے پائے۔ اگلی ملاقات میں بیگم صاحبہ نے مجھ سے اُن نئے کمبلوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میری خاموشی سے انہیں معلوم ہو گیا کہ کمبل مجھ تک نہیں پہنچ پائے۔ انہوں نے باہر نکل کر احتجاج کیا

تو جیل انتظامیہ اور اٹک قلعہ کے سینئر ذمہ دار افسران نے بیان دیا کہ ہمیں یہ کمبل کبھی دیے ہی نہیں گئے۔"

میاں نواز شریف یہ واقعہ سنا کر ہنسے اور پھر سر کو آہستہ آہستہ دائیں بائیں حرکت دیتے رہے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ مجبوری کے عالم میں انسان کو کیا کیا کچھ برداشت کرنا پڑ جاتا ہے اور بیچارے ملازمت پیشہ افراد اپنے سینئرز کے حکم کی بجا آوری میں کس طرح کے غیر انسانی اقدامات کرتے ہیں۔ پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے زندان خانے میں فوجی حکمرانوں کے حکم سے جو سلوک روا رکھا گیا وہ ہماری تاریخ کا ایک الم ناک باب ہے۔ بیس برس بعد بھی وہی ہتھکنڈے ایک بار پھر ایک منتخب وزیراعظم کے خلاف آزمائے جا رہے تھے۔ نواز شریف کہنے لگے: "دسمبر 2000ء کے رمضان المبارک کا آغاز تھا۔ روزے، اور تراویح باقاعدگی سے جاری تھیں۔ سحری اور افطاری کے اوقات میں بھی پریشان کیا جاتا اور ایسا بھی ہوا کہ مجھے وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی سحری کروا دی گئی لیکن ان حرکات کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرا اللہ پر پورا بھروسہ تھا وہ مجھ پر مہربان تھا اور میری نیت سے آگاہ تھا"۔ پھر وہ کہنے لگے: "رمضان المبارک کے انہی دنوں ایک دن بیگم کلثوم نواز میرے پاس اچانک اٹک قلعے میں پہنچ گئیں۔ یہ ملاقات کا دن نہیں تھا اور نہ ہی مجھے ملاقات سے قبل جیل حکام نے مطلع کیا تھا اس اچانک ملاقات پر میں کچھ حیران اور پھر پریشان ہوا۔ ملاقات ہوئی تو بیگم صاحبہ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور میرے دل میں بھی خدشات کا ایک طوفان برپا تھا۔ سلام دعا کے بعد سنتری تھوڑا پرے ہوا تو بیگم صاحبہ نے مجھے کہا: "ہم سب سعودی عرب جا رہے ہیں،

ایک عجیب سے لہجے میں میاں نواز شریف صاحب نے یہ الفاظ ادا کیے اور یہ بے ساختہ بھی تھے مجھے بھی ششدر کر گئے اور اُن کے الفاظ دو بار میری سماعت سے ٹکرائے وہ کہہ رہے تھے: ''میں نے بیگم صاحبہ کی بات سنتے ہی انکار کر دیا اور اُن سے کہا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ خاموش ہو گئیں۔ وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھیں۔ ملاقات کا وقت بھی غالباً مختصر رکھا گیا تھا۔ اس دوران بار بار جیل حکام ارد گرد چکر لگاتے رہے۔ بیگم صاحبہ چلی گئیں اور میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے اور دنیا کیسے رنگ بدل رہی ہے۔ بیگم صاحبہ جب وہاں سے رخصت ہوئیں تو اُن کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نجانے وہ کتنی اُمیدیں وابستہ کر کے تشریف لائی تھیں ...... حیرانی کی بات کہ تیسرے ہی روز وہ پھر میرے پاس اٹک آ گئیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ حالات میں تیزی سے کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ وہ میرے سامنے موجود تھیں اور کہہ رہی تھیں: ''میں نے آپ کے انکار کی بات ابا جی (میاں محمد شریف مرحوم) کے گوش گزار کر دی تھی۔ بیگم صاحبہ کہنے لگیں ابا جی نے کہا ہے کہ نواز سے جا کر کہنا یہ میرا حکم ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ سعودی عرب جانا ہو گا۔ میں نے ابا جی کا حکم سنتے ہی اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا کہ حکم کی تعمیل ہو گی''۔

اُن تاریخی لمحات کی نقاب کشائی کرتے ہوئے میاں نواز شریف کہہ رہے تھے: ''ابا جی کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی اس لیے میں نے ہاں کہہ دی اور سعودی عرب جانے کا فیصلہ کر لیا''۔ نواز شریف نے کہا: ''میری زندگی میں کئی بار ایسے لمحات آئے جب ابا جی نے میری خواہش کے برعکس فیصلے سنائے اور میں نے انہیں تسلیم کر لیا۔ میں نے اُن کے معمولی سے اشارے کو بھی حکم ہی سمجھا۔ اب بھی انکار کا

حوصلہ نہ کر سکا اور یوں قلعہ اٹک کے اندر ہی سعودی عرب جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ایک رات تقریباً دو بجے مجھے نیند سے بیدار کر دیا گیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ جیل کے اندر غیر معمولی ہلچل ہے اور تمام روشنیاں بھی آن کر دی گئیں ہیں۔ کوٹھری سے باہر نکلنے کو کہا گیا تو میں نے باہر نکل کر سب سے پہلے آسمان کی طرف دیکھا ستارے چمک رہے تھے اور صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ مختلف سیاہ شیشوں والی گاڑیاں اور گارڈ قطاروں میں موجود تھے۔ مجھے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ بتایا نہ گیا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی کوئی ضرورت محسوس کی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور ہماری منزل کہاں ہے۔ اردگرد موجود تمام لوگ ہمہ وقت خاموش اور سنجیدہ رہے۔''

نواز شریف صاحب نے پھر کہا: ''ڈاکٹر صاحب، گاڑی تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد رکی تو مجھے باہر نکلنے کو کہا گیا۔ یہ ائیر پورٹ تھا۔ چکلالہ ائیر پورٹ جسے میں بخوبی جانتا اور پہچانتا تھا۔ یہاں میں نے لاتعداد مرتبہ لینڈ کیا تھا، متعدد سربراہانِ مملکت اور سرکاری مہمانوں کو خوش آمدید کہا تھا اور اسی جگہ ان گنت بار جنرل پرویز مشرف مجھے سلوٹ کر چکے تھے۔ میں نے چکلالہ ائیر پورٹ دیکھا تو سوچا کہ ان لوگوں نے خاصی جلدی میں تیاری کی ہے۔ وہاں بھی ہر طرف مسلح فوجی جوان موجود تھے۔ مجھے ائیر پورٹ پر موجود ہال میں لیجایا گیا اور وہاں بٹھا دیا گیا چند ہی لمحوں بعد میں نے دیکھا کہ میرے والد اور والدہ محترمہ بھی تشریف لا رہے ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں آگے بڑھا انہوں نے مجھے پیار کیا اور تا دیر گلے لگائے رکھا۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور یہ وہ لمحہ تھا جس کا میں بیتابی سے منتظر تھا اور یہ ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ بیگم کلثوم نواز، میرے بچے

اور پھر اُن کے بچوں کے علاوہ جناب شہباز شریف اور جناب عباس شریف بھی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ موجود تھے وہ سب خوش تھے سب کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ میں نے سب کو باری باری گلے لگایا سب سے مل کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ایک طویل عرصہ بعد ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ دل پر افسردگی اور اُداسی کا بوجھ بھی تھا کیونکہ ہم اپنے ملک سے جلاوطن ہو رہے تھے۔ یہ ایک عجیب مرحلہ تھا جہاں خوشی اور غم متصادم تھے۔ ہم سب نے اکٹھے سحری کی، ابھی چائے پی رہے تھے کہ ہمیں لے جانے والے سعودی عرب کے خصوصی جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے۔ ہم سب بوجھل قدموں کے ساتھ اس میں سوار ہوئے اور اُس سے پہلے اپنے وطن کی حسین زمین اور خوبصورت آسمان کو جی بھر کہ دیکھا۔ پھیلتے اُجالے کے ساتھ ہی ہم نے پاکستان کو الوداع کہا جہاز کا دروازہ بند ہوا ہم اپنی نشستوں پر دراز ہوئے اور پھر چند ہی گھنٹوں میں ہمارا خاندان سعودی عرب پہنچ گیا۔"

جلاوطنی کے بعد۔ مدینہ منورہ میں نواز شریف سے پہلی ملاقات

نواز شریف جب پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے، اُن سے کبھی کبھار ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ویسے تو ان سے اپنی اولین ملاقات کو یاد کروں تو ذہن کے کسی نہاں خانے میں ایک ہیولا سا اُبھرتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں اتفاق کالونی کے بالمقابل کرکٹ گراؤنڈ میں کسی میچ کے دوران میں اُن سے پہلی بار ملا تھا۔ بعدازاں لاتعداد ملاقاتوں کا عنوان بن گئی۔ اُن کا نوجوان اور سرخ وسپید چہرہ مجھے آج بھی یاد آتا ہے جس پر ایک خوشحال اور صحت مند بچے کی سی معصومیت کھیل رہی تھی۔ نواز شریف اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے تو ان کی بے پناہ سیاسی مصروفیات کے باعث بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ جب پہلی بار وزارتِ عظمیٰ سے محروم کیے گئے تو میں اُن کے والد میاں محمد شریف صاحب سے اُن کے دفتر واقع ایمپرس روڈ میں ملا تو انہوں نے بڑی محبت سے کہا کہ اب آپ میاں نواز شریف کے دست وبازو بن کر جمہوریت کی جدوجہد میں شریک ہو جائیں اُس کے بعد انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مختار صاحب کے ذریعے یہ پیغام نواز شریف صاحب تک پہنچایا۔ جس کا ذکر انہوں نے مجھ سے کئی بار کیا اور کہا کہ میرے والد آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔

نواز شریف دو بار وزیراعظم بنے اور دو بار ہی پاکستان کی مرکزی سیاست کے سب سے بڑے اپوزیشن لیڈر رہے، میں جب بھی اُن سے ملا، اُن کی محبت اور گرمجوشی میں کوئی کمی محسوس نہ ہوئی۔ وہ حوالہ زنداں کیے گئے۔ تب بھی کسی نہ کسی شکل میں، دوستوں کے توسط سے، پہرے اور بندوقوں کے سائے میں ان کو دیکھنے میں کامیابی ہوئی۔ بکتر بند گاڑی سے نکل کر عدالت کی طرف جاتے ہوئے اُن کو

دیکھا، اُن کے چہرے پر لکھی جانے والی وقت کی لکیروں کو پڑھا، کہ اُن کے عزم و عزیمت اور پائے استقلال میں کوئی کمی نہ دیکھی اور اُن کے کردار میں کوئی اضمحلال نہ آسکا۔ آج دنیا بھر میں نواز شریف کو جس بے مثال لیڈر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور اُن کی دوستی کا وسیع دائرہ ایک دنیا کو محیط کیے ہوئے ہے، اس میں اُن کی اسی کرشماتی شخصیت اور عزیمت کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اُن کی شخصیت کا یہ عنصر بہت سے افراد کے لیے باعث کشش بھی ہے اور وجہ افتخار بھی!

میاں محمد نواز شریف کو جب ایک اندھیری رات میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ سعودی عرب روانہ کیا گیا تو میرا اُن سے ساتھ وہاں بھی نہ چھوٹ سکا۔ سعودی عرب میں اُن سے پہلی ملاقات عجیب ماحول میں ہوئی۔ میں حسب معمول سعودی عرب گیا ہوا تھا۔ عمرہ کی سعادت کے بعد رمضان کے آخری عشرہ میں حاضری کے لیے مدینہ مبارک میں موجود تھا۔ دل و جان کو تسکین شہرِ مدینہ ہی میں ملتی ہے۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کے روزہ مبارک کو آنکھوں سے چومتا ہوا باہر نکلا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد جی چاہ رہا تھا کہ کچھ چہل قدمی کی جائے چنانچہ مسجد نبوی سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ گرد و نواح میں واقع بازاروں کی طرف نکل گیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مجھے اُوبرائے ہوٹل اور گرین پیلس (قصرالاخضر) ہوٹل کے کنارے چوک میں ایک دوکان کے باہر خاصہ رش نظر آیا۔ وہاں لوگوں کا جم غفیر بھی تھا اور سیکورٹی گارڈز کی تعداد بھی معمول سے زیادہ تھی۔ یہ مجمع مدینہ منورہ میں عطریات کی مشہور دوکان (العطور القرشی) کے سامنے تھا۔ میں آگے بڑھا۔ دوکان میں جھانکا تو دیکھا کہ میاں نواز شریف اور اُن کی اہل خانہ عطریات خرید رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں دیوانہ وار دوکان کے دروازے کی طرف

لپکا سعودی سیکورٹی حکام نے روک لیا۔ میں وہیں رک گیا اور اُن کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سیکورٹی حکام کی تعداد بہت زیادہ تھی اور حصار بھی بہت سخت تھا ایک لمحے کو شک ہوا کہ شاید میں میاں صاحب کو نہ مل سکوں اس دوران عربی زبان سے میری واقفیت کام دکھا گئی اور میں دوکان کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

میاں نواز شریف دوکان سے باہر نکلے تو میں والہانہ اُن کی طرف بڑھا۔ انہوں نے بانہیں وا کردیں۔ ہم خوب گلے ملے۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ میں نے انہیں قید سے رہائی اور دنیا کی بہتریں جگہ پر آنے کی مبارکباد دی۔ میاں صاحب کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب، میں اُوبرائے ہوٹل میں مقیم ہوں، وہاں تشریف لایئے، مفصل باتیں ہونگی۔'' میں نے کسی اور دن کا انتظار نہ کیا اور اُسی وقت اُن کے پیچھے پیچھے اوبرائے ہوٹل پہنچ گیا۔ سیکنڈ فلور کے استقبالیہ پر پہنچا تو وہاں مسلم لیگی کارکنان ارشد خان اور بھٹی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میری آمد کی اطلاع کی گئی۔ فوراً اندر سے اجازت آ گئی۔ نواز شریف صاحب سے گفتگو ہوئی تو احساس ہوا کہ انہیں ملک سے نکالے جانے کا شدید غم ہے اور اپنے عوام سے دور ہونے کا رنج بھی کیونکہ انہوں نے اُن پر اظہارِ اعتماد کر کے وزارتِ عظمیٰ کے بلند مرتبے تک پہنچایا تھا۔ وہ اس لحاظ سے خوش اور مطمئن تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے ملک میں آنے کا موقع فراہم کیا ہے جس میں دنیا کے دو ایسے بے مثال شہر واقع ہے جن کی مٹی کا ایک ایک ذرّہ پاکیزہ ہے اور کرہ ارض پر موجود تمام مسلمان اسے چومنا سعادت سمجھتے ہیں۔ میاں صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے کافی طلب کی اور کافی بھی وہ جو وہ خصوصی طور پر اپنے لیے بنواتے تھے۔ خود بھی نوش کی اور مجھے بھی اصرار سے پلائی۔

دل و جان خوش ہوئے اور بہت سی نئی باتیں جاننے کو ملیں۔

میاں نواز شریف کو جلاوطن کر کے اسلام آباد میں واقع چک لالہ کے فوجی ہوائی اڈے سے روانہ کیا گیا تو انہیں لے جانے والا سعودی جہاز جدہ کے شاہی ہوائی اڈے (مطار الملکی) پر اُترا تھا۔ مکہ کے اُس وقت کے گورنر شہزادہ ماجد بن عبدالعزیز اور دیگر اکابرین نے اُن کا استقبال کیا تھا انہیں سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا گیا تھا اور ایک خصوصی کاروان کے ذریعے جدہ شہر کے جنوب میں واقع سمندر کے کنارے ایک بلند ترین عمارت (قصر المؤتمرات) گیسٹ پیلس میں ٹھہرایا گیا۔ یہ پندرہ منزلہ عمارت شاہی مہمانوں کے لیے مخصوص ہے ابتدا میں جناب نواز شریف اور اہل خانہ کے لیے اس عمارت کے تین فلور مخصوص کیے گئے تھے جو سینکڑوں کمروں پر مشتمل تھے بعد ازاں نواز شریف صاحب کی خواہش پر ایک فلور پر اُن کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے مجھے کئی بار اس عمارت میں قیام کا موقع ملا ہے کمرے اور ہال فائیو سٹار ہوٹل کے معیار کے ہیں۔ یہ عمارت ابتدا میں انٹر کونٹینینٹل ہوٹل کے لیے تعمیر کی گئی تھی مگر بعد ازاں بعض وجوہ کی بنا پر انٹر کونٹینینٹل ہوٹل کی بجائے اسے گیسٹ پیلس بنا دیا گیا اور یہاں پر اب بھی تمام سٹاف اور سہولیات انٹر کونٹینینٹل ہوٹل کی طرف فراہم کی جاتی ہیں۔

نواز شریف صاحب کو آمد کے ساتھ ہی اُس وقت کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ جو کہ اب شاہ فہد بن عبدالعزیز کی رحلت کے بعد شاہ عبداللہ بن چکے ہیں اور فخر سے خود کو شہنشاہ کہلانے کے بجائے خادمین الحرمین الشریفین کہلاتے ہیں کے حکم پر وی وی آئی پی کا درجہ دیا گیا تھا جو اب تک جاری ہے۔ سعودی رائل پروٹوکول جسے عربی میں مراسم الملکی کہتے ہیں نے جناب نواز شریف کا نام ایک خصوصی فہرست میں شامل کر لیا

تھا جسے اشخاص الکبار کہتے ہیں۔ شاہ عبداللہ نے ساری دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ وہ نواز شریف سے محبت کرتے ہیں اور انہیں اپنے وجود ہی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

دراصل نواز شریف صاحب نے یہ جلاوطنی اپنے عظیم اور بزرگ والد گرامی جناب میاں محمد شریف مرحوم کی خواہش پر قبول کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیے۔ وہ مقدس مقام پر پہنچ گئے اور تمام سہولتیں اُن کی خدمت میں حاضر ہوگئیں۔

جدہ میں چند روز قیام کے بعد میاں نواز شریف اور اُن کا خاندان مکۃ المکرّمہ منتقل ہو گیا وہاں انہیں خانہ کعبہ کے بازو میں واقع گیسٹ پیلس (قصر السلامہ) میں ٹھہرایا گیا وہاں بھی پورا فلور اُن کے زیر استعمال تھا۔ یہاں پر تین محل ساتھ ساتھ تعمیر کیے گئے ہیں سب سے بلند محل سعودی عرب کے فرمارواکے لیے مختص ہے اور اُس کے بعد دوسرا محل ولی عہد اور دیگر شاہی افراد کے لیے ہے اور تیسرا محل شاہی مہمانوں کے لیے بنایا گیا اس کا تمام انتظام بھی انٹرکونٹینینٹل ہوٹل کے پاس ہے اس محل کے فلور نمبر پندرہ پر ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے جہاں سے خانہ کعبہ اور حرم نظر آتا ہے یہاں آپ خانہ کعبہ کو نگاہ میں رکھ کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ سعودی علمائے کرام نے اسے حرم کا حصہ قرار دے دیا ہے تاکہ خادم الحرمین الشریفین اور اُن کے مہمانوں کی با آسانی سیکورٹی تقاضے پورے کیے جا سکیں اور وہ یہاں پانچوں وقت نماز ادا کر سکیں۔ ان تمام محلات میں بالکل ایک فائیو سٹار ہوٹل کی طرح کھانے اور میٹنگز کے بڑے بڑے ہال موجود ہیں۔ ہمہ وقت بوفے یعنی سینکڑوں اقسام کے کھانے سجے رہتے ہیں اور کمروں میں مقیم مہمان مینو کے مطابق کھانا یا سنیکس کمرے میں طلب کر سکتے ہیں۔ ٹیلیفون، ٹی وی، انٹرنیٹ، فیکس، انٹرکوم، لانڈری، ہیلتھ کلب، شو

شائن اور دیگر تمام سہولتیں میسر ہیں۔

نواز شریف جلا وطنی کے فوراً بعد عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکۃ المکرّمہ تشریف لے گئے اور پانچ سالہ قیام کے دوران انہوں نے لاتعداد عمرے ادا کیے۔ وہ شاہی گارڈز کی حفاظت میں خانہ کعبہ میں تشریف لاتے تھے اور عمرہ یا طواف کے فوراً بعد بیت اللہ شریف میں اَذان دینے کی جگہ 'مکبر' کے بالکل سامنے بیٹھ جاتے محافظ حصار قائم کر لیتے سینکڑوں پاکستان اردگرد بیٹھ جاتے اور باری باری آ کر اُن سے ہاتھ ملاتے بات کرتے اور رخصت ہو جاتے۔ میں نے ایک بار رمضان المبارک کے دوران چند دن اُن کے ساتھ بیت اللہ میں گزارے۔ وہ پانچ وقت کی نماز بیت اللہ میں ادا کرتے۔ افطار سے ایک گھنٹہ قبل اپنی مخصوص جگہ پر موجود ہوتے تھے اسی دوران میں نے اُن سے اعجاز الحق صاحب کے بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ وہ عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہوئے ہیں فی الحال جدہ میں ہیں رات کسی وقت آئیں گے آپ اُن سے ملاقات ضرور کر لیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن بعد ازاں افطار کے بعد طواف کے دوران اعجاز الحق کو سامنے آنے پر گلے لگا لیا۔ چند باتیں ہوئیں اور پھر طواف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نواز شریف باقاعدگی سے خانہ کعبہ کا طواف اور مکۃ المکرّمہ میں حاضری دیتے رہتے تھے۔ وہ پاکستان سے عمرہ کی غرض سے آنے والے عام لوگوں سے بڑی محبت سے ملتے اور انہیں مبارکباد دیتے تھے۔

میاں نواز شریف اور اُن کے اہل خانہ مکۃ المکرّمہ سے بعد ازاں مدینہ منورہ منتقل ہو گئے وہاں اُن کا قیام حرم نبوی کے ساتھ ہی واقع ہوٹل اوبرائے میں تھا

جہاں سٹاف اکثریت پاکستانیوں پر مشتمل تھی یہیں میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ان دنوں اُن کا وزن خاصہ کم ہوگیا تھا اور کمزور بھی محسوس ہورہے تھے دراصل اٹک کے خوفناک قلعے میں جس طرح قید تنہائی میں رکھا گیا تھا اور جس انداز میں ذہنی اذیت دی گئی تھی اور دباؤ میں رکھا گیا تھا فطری طور پر اُن کا وزن بھی کم ہونا چاہیے اور انہیں کمزور بھی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ وہ افسردہ یا پژمردہ نہیں تھے بلکہ ہشاش بشاش تھے۔ ذہنی طور پر بھی چوکس تھے۔ اُن سے کوئی ذاتی گفتگو نہ ہوئی۔ مجھ سے بار بار پوچھا: ''پاکستان کب واپس جائیں گے؟ عید کہاں ادا کریں گے؟'' میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ زندگی میں پہلی بار پاکستان سے باہر عید ادا کریں گے اس لیے وطن کو شدت سے یاد کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی ان کو یہاں آئے بہت کم عرصہ ہوا ہے اور نہ جانے کب تک یہاں رہنا پڑے۔ یہ ایک قدرتی احساس ہے کہ انسان چاہے دنیا کے معتبر ترین اور اعلیٰ ترین خطے اور مقام پر ہی کیوں نہ ہو، زندگی کی جملہ سہولتوں سے لطف انداز بھی ہو رہا ہو۔ اہل خانہ بھی ساتھ ہوں۔ عید اور شب برات کے موقع پر وطن کی مٹی، دیس کی ہوائیں اور فضائیں بے حد یاد آتی ہیں اور دل بجھ سا جاتا ہے۔ جناب نواز شریف کا یہی حال تھا۔ وہ نئے نئے جلاوطن کیے گئے تھے اُن کے احساسات اور خیالات کیا ہوسکتے ہیں اس کا اندازہ کرنا شاید کسی اور کے بس میں نہ تھا۔ نواز شریف جتنا عرصہ مدینہ شریف میں رہے، وہ تمام نمازیں مسجد نبوی میں ادا کرتے، اکثر اپنے والد صاحب کے ہمراہ مسجد میں حاضری دیتے، عشاء کی نماز وہ دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔ میں نے اُسی رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے دوران انہیں دیکھا کہ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ تراویح کے لیے مسجد نبوی آتے تھے۔ روزہ بھی وہ مسجد رسول ﷺ ہی میں افطار کرتے

اس دوران اُس عالمی اسلامی برادری میں جذب ہو جاتے جو کرۂ ارض کے کونے کونے سے خصوصی طور پر رمضان المبارک کا آخری عشرہ گزارنے یہاں کا رخ کرتی ہے۔ افطاری کے وقت مسجد نبوی ﷺ اور صحن مسجد نبوی ﷺ میں جو روح پرور نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے اُس کی نظیر پوری دنیا میں کہیں نظر نہیں آ سکتی۔ ایک غیر معمولی منظر ہوتا ہے۔ دستر خوانوں کی قطاریں شمار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ لاکھوں افراد صرف درود و سلام پڑھتے افطار کے منتظر ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے لوگ انواع و اقسام کے کھانے، کھجوریں اور قہوہ سے حرم نبوی ﷺ کو بھر دیتے ہیں۔ لاکھوں افراد کے افطار کا انتظام ہوتا ہے مدینہ کے باسی روزہ داروں کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں اور اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ عالم اسلام سے آئے ہوئے روزہ دار اُن کی لائی گئی اشیاء سے روزہ افطار کریں۔ بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے سعودی ذاتی خادموں کی طرح مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ باپردہ مقامی خواتین اپنے ملازمین کے ذریعے یہ فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ اسلامی اخوت کی یہ مثال قابلِ دید ہوتی ہے۔ دل کو ایک عجیب خوشی اور روحانی بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔

رمضان المبارک کے اس آخری عشرہ کے دوران روزانہ افطار اور تراویح کے وقت مسجد نبوی ﷺ کے صحن میں نواز شریف صاحب سے ملاقات ہوتی۔ اُن کے ساتھ کئی روزے افطار کرنے کا موقع ملا۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ وہ مسجد نبوی ﷺ خاص کر اُس جگہ تشریف رکھتے جس طرف نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کا رُخ ہے۔ وہ خاموشی سے آتے اور ادب و احترام اور انتہائی انکسار کے ساتھ وہاں بیٹھ جاتے۔ اُن کے چہرے پر اُمید، چمک اور رونق کے علاوہ کبھی کبھار یاس کے اثرات بھی ابھرتے، میں خاموشی سے انہیں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ وہ سفید شلوار قمیض

اور سفید ٹوپی میں ملبوس ہوتے۔ نماز کے دوران انہماک دیکھنے والا ہوتا تھا۔ جب وہ نماز پڑھنے آتے تو سینکڑوں لوگ اُن کے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے اور اُن سے ملاقات کے خواہش مند ہوتے۔ میاں صاحب کی حفاظت پر مامور سعودی سکیورٹی حکام لوگوں کو دور رکھنے کی مکمل کوشش کرتے لیکن لوگ قابو میں آئے بغیر آگے بڑھتے اور نواز شریف سے مصافحہ اور معانقہ کرتے۔ اُن کی وارفتگی دیکھ کر سکیورٹی حکام خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتے۔ میں نے اسی جگہ یہ حیرت انگیز مناظر بھی دیکھے کہ نواز شریف کو ملنے کے لیے پاکستان کے علاوہ دیگر مسلم ممالک کے لوگ بھی جوق در جوق آتے انتہائی محبت سے اپنے انداز میں نواز شریف کے ہاتھ چومتے اور اُن کے کاندھے کو بوسہ دیتے۔ ایک روز موقع پا کر تیونس، مراکش، لیبیا، اور متحدہ عرب امارات سے تعلق رکھنے والے برادرانِ اسلام سے پوچھا کہ آپ نواز شریف سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں۔ نہ تو وہ کبھی آپ کے حکمران رہے ہیں نہ وہ آپ کے ملک کے شہری ہیں تو پھر آپ کی عقیدت کس وجہ سے ہے؟ جن لوگوں سے میں نے یہ سوال کیا تھا انہوں نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر خوشی اور جوش کے عالم میں کہا کہ ”نواز شریف ایک بہادر اور اعلیٰ لیڈر ہے (رجل جری و ممتاز) انہوں نے امریکہ کی دھمکی کے باوجود ایٹمی دھماکہ کر کے وہ لاثانی معرکہ سرانجام دیا تھا جس نے ہمارے سر فخر سے بلند کر دیے ہم بجا طور پر نواز شریف کو عالم اسلام کا ہیرو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے کہ عجیب بات ہے کہ آپ کی فوج نے نہ صرف اُنہیں اقتدار سے محروم کیا بلکہ جلاوطن بھی کر دیا“۔

کیبل اور انٹرنیٹ کے علاوہ جدید ذرائع ابلاغ نے ساری دنیا کے راز فاش کر دیے ہیں۔ اب کسی ملک کا باشندہ کسی بھی دوسرے ملک کے حالات سے بے خبر

نہیں ہے۔ پاکستان کے حالات سے دنیا بھر کے مسلمان آگاہ ہیں۔ شخصیات سے آگاہ ہیں۔ مجھے ان لوگوں کا آخری جملہ سن کر ندامت بھی ہوتی اور یہ احساس بھی ہوتا کہ نواز شریف کی شہرت اور مقبولیت خوشبو کی طرح پھیل گئی۔

نواز شریف جب تک مدینہ منورہ میں اقامت پذیر رہے، وہ مسجد نبوی ﷺ کے علاوہ اپنے ہوٹل میں بھی پاکستان اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے افراد سے ملاقات کرتے تھے۔ اُن کی رہائی کی خبر تازہ تھی اور دنیا بھر کے میڈیا کے توسط اس کی بازگشت جاری تھی۔ لوگ گروہ در گروہ نواز شریف سے ملنے آتے اور اپنے جذبات کا اظہار کرتے اور اکثر کے لہجوں میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف غصہ بھرا ہوا ہوتا۔ نواز شریف کی طرف سے ملنے والوں کو عربی قہوہ، مٹھائی اور کھجوریں پیش کی جاتیں۔

قید سے رہائی کے بعد نواز شریف نے اپنی پہلی عید مدینۃ المنورہ میں ہی ادا کی۔ وہ مسجد نبوی ﷺ میں ادائیگی نماز کے لیے آئے تو اُن کے ساتھ بڑے میاں صاحب بھی تھے جنہیں نواز شریف نے بڑے پیار اور احترام سے تھام رکھا تھا۔ اُن کے ہمراہ شہباز شریف، عباس شریف، حسین نواز شریف، کیپٹن صفدر اور سہیل ضیاء بٹ کے علاوہ کئی عزیز و اقرباً بھی تھے۔ عید کی نماز کے بعد قطاروں میں کھڑے ہزاروں پاکستانی نواز شریف سے بغل گیر ہوئے اور انہیں مبارکباد دی۔ یہ ایک عجیب منظر تھا ایک شخص برطرفی اور جلاوطنی کے بعد بھی وزیراعظم تھا۔ لوگوں کی محبت قابلِ دید تھی۔ نواز شریف انتہائی صبر اور ہمت کے ساتھ کئی گھنٹے تک لوگوں کو عید ملتے رہے۔ میں نے تقریباً دوپہر بارہ بجے ان سے ہوٹل میں ملاقات کی اور اسی شام واپس جدہ چلا گیا۔

سیکورٹی چیف کے سخت اشارے

سعودی عرب میں نواز شریف صاحب کے قیام کے دوران جتنی بھی ملاقاتیں جہاں جہاں بھی ہوئیں سب اپنی جگہ دلچسپ اور تاریخی قرار دی جاسکتی ہیں۔ جلاوطنی کے دوران مکہ معظّمہ، مدینۃ المنورہ اور جدہ میں میری جتنی آزادانہ اور لاتعداد ملاقاتیں ہوئیں، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی دوسرے پاکستانی کی اتنی نہیں ہوئی ہونگی۔ یہ میاں نواز شریف کی محبت اور مہربانی تھی کہ میں نے جب اور جہاں چاہا اُن سے ملاقات کرلی۔ اس ضمن میں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ کسی اخبارنویس نے بھی اُن سے اتنی لاتعداد اور مفصل ملاقاتیں نہیں کی ہونگی۔ مجھے اس پر فخر کہ میں نے مختلف لمحوں اور موقعوں پر نواز شریف کو قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔ کہ شاید آیت اللہ خمینی کی فرانس میں جلاوطنی کے دوران مصر کے نامور صحافی حسنین ہیکل بھی خمینی صاحب کو اتنی بار نہ ملے ہونگے جتنی بار میں نواز شریف سے ملا ہوں۔

ایسی ملاقاتوں میں ایک دلچسپ ملاقات مدینہ شریف میں ہوئی۔ سعودی عرب میں یہ اُن کا چوتھا رمضان المبارک تھا۔ میں بھی حسبِ معمول مدینہ منورہ میں حاضر تھا اور اکثر وپیشتر افطار حرم نبوی ﷺ میں اُن کے ہمراہ ہوتا۔ ایک روز یونہی میں افطار سے قبل حرم نبوی ﷺ کی چاردیواری کے ایک گیٹ سے اندر داخل ہوا تو نواز شریف صاحب بھی اُوبرائے ہوٹل سے اُتر کر آرہے تھے میں نے آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ بہت خوشی اور محبت سے ملے وہ مسجد کی طرف جارہے تھے میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا ہم باتیں کرتے آہستہ آہستہ مسجد نبوی ﷺ کی طرف بڑھنے لگے۔ جناب اسحاق ڈار، نواز شریف کے وزیرخزانہ اور اب سمدھی

بھی ہمراہ تھے۔ روزہ افطار ہونے میں کچھ وقت تھا لیکن نمازیوں کا رش بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ہر شخص کی فطری خواہش تھی کہ وہ مسجد کے صحن کے اندر یا روضۂ رسول ﷺ کے قریب روزہ افطار کرے۔ رش کی وجہ سے ہم مسجدِ نبوی ﷺ کے اندر بنوائے گئے سائبانوں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد اُن سے گفتگو شروع ہوئی۔

مسجد میں بہت رش تھا۔ لوگ افطاری کا انتظار کررہے تھے صف در صف خاموشی سے باادب بیٹھے تھے۔ دل ہی دل میں درود شریف پڑھا جارہا تھا۔ سب کے سامنے افطاری کے لیے انواع واقسام کا سامانِ خورد ونوش رکھا تھا۔ بڑا ہی روح پرور اور پر تسکین منظر تھا۔ پاکستان کے حالات کے بارے میں بات ہوئی میں نواز شریف صاحب کے بالکل قریب دائیں جانب بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ موجودہ فوجی حکمرانوں کو ہٹانے کے لیے بہت بڑے انقلاب کی ضرورت ہے۔ نواز شریف نے نہایت شائستگی اور دھیمے لہجے میں کہا: ''انقلاب تو ہر پاکستانی کے دل میں برپا ہوچکا ہے۔ جنرل مشرف نے گذشتہ برسوں میں پاکستانی قوم، معاشرے، سیاست، آئین اور عدالتوں سے سلوک کیا ہے اُس کے بہت برے نتائج مرتب ہونگے ہر پاکستانی ناراض اور نالاں ہے۔ اُن کی اندرونی اور بیرونی پالیسیاں تباہ کن ہیں جنرل صاحب کے خلاف پاکستانی معاشرے اور عوام نے اظہار کیا ہے اور یہ نفرت کا الاؤ ایک انقلاب ہی تو ہے۔ جناب نواز شریف جس باریکی کے ساتھ پاکستان میں بدلتے حالات اور پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کررہے تھے اس سے یوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہونے کے باوجود بھی پاکستان ہی میں ہیں اور اُن کا ہاتھ پاکستانی معاشرے کی نبض پر ہے۔ اسحاق ڈار زیادہ وقت خاموش رہے اور

تسبیح پرورد کرتے رہے پھر اچانک بولے انقلاب دور نہیں ہے آیا تو سب ظالموں کو بہا کر لے جائے گا۔

اسی گفتگو کے دوران میری نظریں پچھلی جانب اُٹھیں تو دیکھا کہ نواز شریف کے گرد موجود سکورٹی اہلکاران کا چیف میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ میں نواز شریف کے قریب سے اُٹھ جاؤں اور خاصے غصّے میں بار بار اشارے کر رہا تھا ایک دو بار تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور مجھے اپنے بارے میں صرف وہم ہے لیکن جب میں نے غور سے دیکھا تو اُس نے سختی اور چہرے پر خشونت طاری کرتے ہوئے مجھے اشارے سے اُٹھ جانے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے بھی اُسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا لیکن وہ باز نہ آیا۔ تو میں نے نواز شریف صاحب کو اس بارے میں بتا دیا وہ اس پر ناراض ہوئے اور سختی سے سیکورٹی گارڈ کو کہا کہ یہ میرے دوست ہیں۔ اس کے بعد ہم دوبارہ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

نواز شریف ایک حساس ذہن اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں اپنے دوستوں اور احباب کے بارے میں خاصے حساس واقع ہوئے ہیں۔ غریب، نادار اور بیمار افراد کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک روز میں اُن کے پاس جدہ کے سرور پیلس میں اُن کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ سیاسی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ میاں صاحب نے عینک لگا کر اپنے سامنے رکھی ایک پرچی غور سے پڑھی۔ سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل فون اُٹھایا اور لمحے بھر میں وہ لاہور کے کسی ہسپتال میں داخل کسی مریض بچی کی والدہ سے محو گفتگو تھے۔ انہوں نے انکسار سے اپنا نام بتایا اور بچی کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ڈاکٹروں کے سلوک اور اخراجات کے بارے

میں پوچھا۔ وہ بڑے سنجیدہ اور پریشان تھے۔ اُس کے بعد انہوں نے مریضہ کی والدہ کی طرف سے مہیا کیے گئے فون نمبرز پر نرس اور ڈیوٹی ڈاکٹر سے رابطہ کیا مکمل تفصیلات جاننے کے بعد انہیں مریض کی خصوصی نگہداشت کے لیے کہا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ فارغ ہو گئے ہیں تو میں اپنی بات کا آغاز کروں مگر انہوں نے اپنے موبائل فون سے مریض بچی کے والد سے بات شروع کر دی، یوں لگتا تھا جیسے اُن کی اپنی بیٹی کی طبیعت ناساز ہے اور وہ اس کے لیے ہر طرح سے اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سارا عمل بیس سے پچیس منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد ان کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی نا قابل بیان لہر دوڑ گئی۔ یہ اطمینان اور روحانی خوشی بنی نوع انسان کی خدمت ہی سے میسر آ سکتی ہے۔

سرور پیلس جدہ میں بھی نواز شریف روزانہ سینکڑوں خط، درخواستیں اور فیکس وصول کرتے ہیں جن میں سے اکثریت میں مالی وطبی امداد کی استدعا کی گئی ہوتی ہے درخواست گزار کا تعلق پاکستان اور سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی ہوتا ہے۔ درخواستوں کی تحقیقات کی جاتی ہے اور پھر حسبِ ضرورت امداد فراہم کر دی جاتی ہے۔ لاہور اور دیگر شہروں میں مستحق اور نادار مریضوں کو شریف میڈیکل سٹی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کی مالی امداد یا اُن کے دیگر مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے عملی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستان سے روانہ کیے گئے لفافوں پر صرف نواز شریف، سعودی عرب تحریر ہوتا ہے اور یہ ڈاک انہیں مل جاتی ہے۔ بعض لفافوں پر نواز شریف معرفت شہزادہ عبداللہ، سعودی عرب لکھا ہوتا ہے یا خالص پاکستانی دیہی انداز میں لکھا ہوتا ہے، شہزادہ عبداللہ سعودی عرب کو مل کر نواز شریف کو ملے۔

مدینہ منورہ سے جدہ روانگی

میاں نواز شریف پاکستان سے جلاوطن کیے جانے کے بعد مدینہ طیبہ میں قیام پذیر رہے یہ ایک بے مثل اور عظیم سعادت تھی وہ سرزمین جس کو ہر مسلمان اپنی پلکوں سے چومنے کا خواہش مند ہوتا ہے جس کی مٹی کو کوئی بھی مسلمان اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے کا آرزومند رہتا ہے۔ قدرت نے ایک عجیب اور حیرت انگیز طریقے سے میاں نواز شریف اور اُن کے خاندان کے لیے اُس پاک خطے میں رہنے کا بہترین انتظام کر دیا تھا۔ یہ بڑے نصیب کی بات تھی۔ یہ بڑے کرم کے فیصلے تھے۔ مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کے مزار مبارک کے عقب میں دو بہت شاندار ہوٹلوں میں میاں صاحب اپنے سارے خاندان سمیت قیام پذیر رہے۔ وہ تمام نمازیں حرم نبوی ﷺ میں ادا کرتے تھے اور خدا کا شکر بجا لاتے تھے کہ اُن کی قسمت میں اس مقام کا قیام لکھا گیا۔ تقریباً تین ماہ بعد نواز شریف اور اُن کے اہل خانہ جدہ منتقل ہو گئے۔

جدہ سعودی عرب کا قدیم ترین اور اب جدید ترین شہر ہے۔ ہزاروں سالوں کو محیط اس کی تاریخ اسے دنیا کے معروف شہروں میں ممتاز کرتی ہے۔ بحیرہ احمر کے کنارے اس خوبصورت اور دلکش شہر سے بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نسل انسانی کے والد اوّل حضرت آدمؑ اور اماں حوّا کی جنت سے جلاوطنی کے بعد اس شہر میں ان کا دوبارہ ملاپ ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے ایک قبر حضرت حوّا کے نام سے منسوب ہے۔ کچھ لوگ اسے (جِد) عربی زبان کا لفظ جس کا مطلب ابا و اجداد ہیں کو اس کا ماخذ قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ اسے جدید سے جدہ کہتے ہیں۔ جدہ شہر میں ایک چوک میں ایک دیوہیکل بائیسائیکل کا ماڈل رکھا ہوا ہے

اور جدہ شہر کے لوگ مذاحاً اسے حضرت آدم کا سائیکل قرار دیتے ہیں اور چند معصوم اور ان پڑھ حاجیوں کو اس کا طواف بھی کروادیتے ہیں۔

سعودی عرب کو خدا نے تیل کی دولت سے مالا مال کیا تو اس مملکت کے جہاندیدہ اور سنجیدہ فرمانرواؤں نے جہاں ملک کے لیے بہترین منصوبہ بندی کی وہاں دنیا کے معروف انجینئرز کی مدد سے جدہ جیسا جدید شہر تخلیق کردیا۔ چند ہی برسوں میں اس شہر نے بے پناہ ترقی کرلی۔ ایک زمانے میں اس شہر کی ترقی اور خوشحالی کا راز اس کی بندرگاہ پر اترنے والے حاجیوں میں تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے نئی شکل اختیار کرلی۔ اس کی بہترین اور جدید تجارتی بندرگاہ نے اس کی معاشی ترقی میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ سعودی عرب کا دارالحکومت ویسے تو ریاض ہے لیکن سعودی حکمرانوں نے جدہ پر خصوصی توجہ دی ہے اور یہی دارالحکومت محسوس ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورتی، فن تعمیر، ڈیزائننگ اور صفائی کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے 1980ء سے لیکر 1984ء تک یہ دنیا کا بہترین اور پرامن شہر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ سعودی عرب کے مغربی، وجنوبی اور شمالی شہروں کا مرکز ہونے کی وجہ سے اسے مزید توجہ ملی ہے اور یہ منطقہ مغربی کا صدر مقام بھی ہے۔

جدہ کی تہذیب، تمدن، معاشرہ، رواج وروایات سعودی عرب کے دوسروں شہروں سے کافی مختلف ہیں۔ یہ باقیوں کے مقابلے میں جدید تہذیب رکھتا ہے اور باقی شہر اس کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ ایک کثیر النّسلی شہر ہے، دنیا کے ہر خطے سے لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں، افریقہ، ایشیا، برصغیر پاک وہند، یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سمیت ہر ملک کا باشندہ یہاں پایا جاتا ہے۔ سفید فام، سیاہ رنگت کے حامل، گندمی رنگ والے اور زرد رنگت کے انسان ہر گلی اور ہر بازار میں گھومتے اور

کاروبار کرتے نظر آتے ہیں۔ جدہ شہر کو بجا طور پر لندن، نیویورک اور سڈنی کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ایک فرق بہت واضح ہے وہ یہ کہ یہ اسلامی تہذیب میں رنگا ہوا ہے۔ جرائم کی شرح تقریباً صفر فیصد ہے۔ جرائم پیشہ افراد کا جرم کے بعد یہاں سے بچ کے نکلنا یا فرار ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ سعودی عرب کے باقی شہروں کے مقابلے میں جدّہ نسبتاً آزاد اور لبرل ہونے کی وجہ اس کا کثیر النّسل اور کثیر اللسان ہونا ہے۔ یہاں دنیا کے ہر قسم کے بہترین کھانے دستیاب ہیں۔ اس شہر میں دنیا بھر کے سفارت خانے اور قونصلیٹ قائم ہیں جس سے یہ شہر مزید توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

جس طرح استنبول کو یورپ کا دروازہ کہا جاتا ہے اسی طرح جدہ کو بھی گیٹ وے ٹو مکہ کہا گیا ہے۔ حجاج کرام اور عمرہ کی سعادت کرنے والے تقریباً سبھی لوگ اسی شہر میں پہلا قدم رکھتے ہیں۔ پھر یہاں سے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوتی ہے۔ اس شہر میں ہوائی جہازوں کی بے پناہ آمدورفت ہے۔ بحری جہازوں کی ٹریفک میں کمی ہوئی ہے۔ ہیتھرو، لندن اور جے۔ایف۔ کے نیویارک کی طرح یہاں اس کا ہوائی اڈا بہت مصروف ہے اور کئی دنوں میں تقریباً ہر ایک منٹ کے بعد یہاں سے کوئی جہاز یا تو روانہ ہوتا ہے یا اُس کی آمد ہوتی ہے۔ تین طرح کے ہوائی اڈے تعمیر کیے گئے ہیں ایک صرف سعودی ایئر لائن، دوسرا بیرون ملک ائیر لائنز اور باقی دو حاجیوں کے لیے مخصوص ہیں۔

جدہ شہر کی شاہراہیں دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاندار ڈیزائننگ کی گئی ہے اور اگلی نصف صدی تک انہیں تبدیل کرنے یا کشادہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ جدہ شہر میں لمبائی اور چوڑائی میں تقریباً سات سات بڑی شاہراہیں تعمیر کی گئیں ہیں اور پھر مختلف سڑکوں کے ذریعے انہیں

آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ پورے شہر میں پہلے کوئی ٹریفک سگنل نہ تھا مگر بعد میں ٹریفک میں اضافہ کی وجہ سے سگنل نصب کیے گئے ہیں۔ یہ شہر اور سڑکوں کا نظام ہو بہو امریکی طرز کا ہے اور اس کی ڈیزائننگ کرنے والے اکثر افراد امریکی ہی تھے۔

جدہ کا ساحل سمندر یورپ اور امریکہ کے کسی بھی شہر سے بہتر ہے بلکہ آپ حیران ہونگے کہ امریکی اور مغربی ساحل اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتے فرق صرف یہ ہے کہ یہ ساحل عریانیت اور فحاشی سے پاک ہے۔ یہ ساحل تقریباً ساٹھ سے ستر کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے یہاں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ کم آمدنی والے افراد سے لے کر بڑے بڑے اُمرا تک لیے ہر طرح اور ہر قسم کی سہولیات اور تفریحات میسر ہیں۔ یہاں پر دنیا کا دوسرا بڑا فوارہ بھی نصب ہے جو رات کو روشنی میں میلوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ساحل پر سواری کے لیے اُونٹ، گھوڑے، بگھیاں، ڈیزرٹ سکوٹر، سی سکوٹرز، لانچ یا چھوٹے جہاز کرائے پر میسر ہیں۔ یہاں پر امیر و غریب یکساں طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ موسم گرما کی تعطیلات یا عیدین کے موقع پر تو یہ ساحل ساٹھ ستر کلومیٹر تک کاروں اور انسانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

اس بے مثال شہر کے ڈاؤن ٹاؤن یا قدیمی شہر کو عربی زبان میں (البلد) کہا جاتا ہے اور اب بھی لوگ سینکڑوں سال قدیم مکانوں میں رہائش پذیر ہیں اور یہ کاروباری مرکز بھی ہے اور یہاں کے زیادہ تر مکین غیر ملکی ہیں اصل عرب باسی جدید آبادیوں میں جا چکے ہیں۔ نواز شریف کا سرور پیلس یہاں سے صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے اور یہ اب پاکستانی سیاست کا مرکز ہے۔

سرور پیلس کا قیام

بہت سے پاکستانی ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان سے جلاوطن کیے جانے کے بعد جناب نواز شریف سعودی عرب کے سب سے بڑے شہر میں کہاں قیام فرماتھے اور اُن کے شب و روز کیسے گزرتے تھے؟ سعودی حکومت نے انہیں ایک شاہی محل (سرور پیلس) فراہم کیا تھا۔ یہ شاہ فیصل بن عبدالعزیز شہید کی ہمشیرہ صاحبہ کی ملکیت تھا اور وہ یہاں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد یہ محل برس ہا برس تک مقفل رہا۔ نواز شریف صاحب کو جدہ پہنچنے پر تین چار محلات دکھلائے گئے مگر انہوں نے اسی کو پسند فرمایا اس کی مرمت اور تزئین اور آرائش کے بعد یہ اُن کے حوالے ہوا۔ اس سے پیش تر سعودی عرب کے وزیر داخلہ اور انٹیلی جنس کے سربراہ شہزادہ ترکی بن عبدالعزیز بھی یہاں اپنا دفتر قائم کرنا چاہتے تھے مگر نواز شریف صاحب کی فرمائش پر انہوں نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ یہ محل تقریباً دو ایکڑ پر مشتمل جدہ کے علاقہ منطقہ بلد (ڈسٹرکٹ الرویس) مدینہ روڈ پر واقع ہے۔ معروف ہوٹل حیات ریجنسی اور اب ریڈیسن اس کے بالمقابل واقع ہے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ بے مثال ہے اور حدود اربعہ کے اعتبار سے بھی نہایت موضوع ہے۔ یہ مہنگا ترین علاقہ ہے اور سمندر سے زیادہ دور نہیں۔ محل میں عمارتوں کے تین بلاکس ہیں۔ تقریباً بارہ کمروں پر مشتمل مرکزی بلاک جس میں نواز شریف صاحب، اُن کے اہل خانہ، والدین اور کیپٹن صفدر رہائش پذیر تھے۔ مرکزی مجلس اور ڈائننگ روم بھی یہیں واقع ہے۔ تقریباً دس کمروں پر مشتمل دوسرے بلاک میں جناب شہباز شریف، جناب عباس شریف اُن کے اہل خانہ، اور جناب سہیل ضیا بٹ قیام پذیر ہیں۔

سہیل ضیا بٹ نے اس محل میں بھی اپنی منفرد دنیا آباد کر رکھی ہے جس کے وہ بے تاج بادشاہ بھی ہیں۔ مہمان خانہ بھی اسی بلاک میں واقع ہے۔ تقریباً بیس کمروں پر مشتمل تیسرا بلاک ملازمین کی رہائش، سٹور، لانڈری وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مرکزی بلاک کے بائیں جانب گاڑیوں کے گیراج ہیں۔ جہاں پر تقریباً دس سے بارہ گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش ہے۔ یہ ترک طرزِ تعمیر کا محل عمارت احاطہ کے بالکل درمیان میں کھڑی کی گئی ہے۔ مین گیٹ جنوب کی طرف کھلتا ہے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوں تو خوبصورت چاردیواری نظر آتی ہے۔ گیٹ کے ساتھ ہی دائیں جانب محافظوں کا کمرہ ہے۔

سرور پیلس کی مرکزی عمارت میں داخل ہوں تو دائیں جانب دو بڑے دفتر نظر آتے ہیں ان کا سائز تقریباً 20'x10' اور 14'x12' ہے۔ اور بائیں جانب تقریباً 20'x12' سائز کی انتظار گاہ ہے اور اسی حصہ میں ہی ایک خوبصورت سی لفٹ لگی ہوئی ہے جو مہمانوں اور اہل خانہ کو اوپر والے حصہ میں لے جاتی ہے۔ رہائشی عمارت کے دروازے کے سامنے دو بڑے ہال ہیں۔ پہلے ہال میں جناب نواز شریف کی نشست گاہ ہے جہاں تقریباً پچاس افراد بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ دوسرا بڑا ہال دراصل ڈائننگ روم ہے جہاں پر ایک لمبی سی میز اور اُس کے اردگرد تقریباً چالیس کرسیاں لگائی گئی ہیں۔ یہ میز اور کرسیاں خوبصورت آبنوسی لکڑی سے بنی ہوئی ہیں محل کے تمام کمروں میں بیش قیمت فانوس آویزاں ہیں۔ ان سے نکلنے والی رنگ برنگی روشنیاں ماحول کو عجیب وغریب ملکوتی حسن عطا کرتی ہیں میں یہ تفصیلات اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے کہ جناب نواز شریف کو جلاوطنی کے دوران بھی اُن کی دوست سعودی حکومت نے انہیں شایانِ شان سہولتیں فراہم کر

رکھی تھیں۔ دنیا کی کوئی ایسی نعمت نہ تھی جو انہیں وہاں فراہم نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نواز شریف وطن واپسی کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ اندرونی رہائش گاہ کی عمارت میں سامنے نظر آنے والے پہلے ہی ہال کے دائیں جانب واقع سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ جہاں عمارت کا وہ حصہ ہے جہاں جناب نواز شریف اور اُن کے اہل خانہ قیام پذیر ہیں۔

اس محل کی اندرونی ڈیکوریشن نواز شریف صاحب کے ماڈل ٹاؤن والے گھر سے مشابہ ہے شاید اس طرح وہ خود کو گھر سے قریب محسوس کرتے ہیں۔

ابتدائی ایام

اس محل میں اقامت اختیار کرنے کے بعد جناب نواز شریف پہلے دو سال تک میڈیا اور پریس سے کم ہی رابطہ رکھتے تھے۔ بعد ازاں ان کے معمولات میں باقاعدگی آتی گئی اور میڈیا سے کا رابطہ بڑھتا گیا۔ لوگوں سے ملاقات کے لیے محل کے مرکزی بلاک میں اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک مستطیل خوبصورت دفتر ترتیب دے دیا گیا تھا۔ جناب نواز شریف باقاعدگی سے اس دفتر میں تقریباً ساڑھے نو بجے صبح تشریف فرما ہوجایا کرتے تقریباً بارہ بجے تک وہیں فروکش رہتے۔ اس دوران طے شدہ ملاقاتیوں سے ملاقات ہوتی۔ اُن کا عملہ تمام شیڈول طے کرتا۔ اس دوران وہ مختلف دوست اور احباب کی ٹیلی فون کالز بھی سنتے تھے۔ گویا نواز شریف نے عوامی زندگی سے کنارہ کشی نہیں کی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ ملاقات کا خواہش مند اُن کے ٹیلی فون نمبرز 3-6512242 پر فون کرتا۔ ڈیوٹی پر موجود پاکستانی آپریٹر یا کسی بھی فرد سے بات کرتا، اپنے مکمل تعارف کے علاوہ سعودی عرب

اور پاکستان میں اپنے رابطہ فون نمبرز تحریر کرواتا۔ ملاقات کی غرض بیان کرتا۔ عملہ نواز شریف صاحب سے پوچھ کر ملاقات کے لیے دن اور وقت بتا دیتا۔ ملاقاتی وقتِ مقررہ پر سرور پیلس کے مرکزی گیٹ (باب الرئیسی) پر پہنچ جاتا۔ مین گیٹ پر موجود شاہی گارڈز (حرس الملکی) آنے والے شخص سے نام پوچھ کر مہمانوں کی لسٹ میں چیک کرتے اور بعدازاں ملاقاتی سے کوئی بھی شناخت (پاسپورٹ، اقامہ، ڈرائیونگ لائسنس یا ویزہ) لے کر اندر جانے کی اجازت دے دیتے۔ مہمان گیٹ سے محل کی عمارت کے مین دروازے پر پہنچتا تو وہاں موجود سعودی فوج کے گارڈ سلام کرتے اور وہیں پر نواز شریف صاحب کے پاکستانی سٹاف کا کوئی بھی فرد اُسے محبت واحترام کے ساتھ انتظار گاہ تک لے آتا۔ انتظار کی صورت میں کیپٹن صفدر، حسین نواز شریف، سہیل ضیا بٹ یا میزبان کا کوئی بھی نمائندہ مہمان کے ساتھ موجود ہوتا اور مشروبات پیش کیے جاتے۔ یہ عمل بڑے اَحسن انداز میں انجام پاتا۔ نواز شریف کو یہاں بھی وزیراعظم جیسا پروٹوکول فراہم کیا گیا تھا سعودی فرمانرواؤں کی دل نوازی اور نواز شریف سے محبت اور دوستی کا ایک واضح اور لافانی اظہار تھا اس میں چھ سال کے دوران کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی نواز شریف صاحب کو یہ احساس ہونے دیا گیا کہ جلاوطنی سے ان کی اہمیت اور مقام میں کوئی کمی آئی ہے۔

جناب نواز شریف ملنے والوں سے ہمیشہ گرم جوشی، تپاک اور احترام سے ملتے۔ انہیں ہر ملنے والا، آشنا یا نا آشنا یہی تصور لے کر رخصت ہوتا کہ اُسے بہت عزت دی گئی۔ نواز شریف صاحب بارہ بجے دوپہر تک ملاقاتیں سمیٹ لیتے کیونکہ سوا بارہ بجے ظہر کی اَذان کا وقت ہو جاتا اور تقریباً بارہ چالیس پر نماز ظہر ادا کی جاتی ظہرانہ کے بعد مجلس برخاست ہو جاتی اور نواز شریف پہلی منزل پر واقع رہائش گاہ میں

تشریف لے جاتے۔ میں نے ان اوقات میں اُن سے کئی ملاقاتیں کیں اور ظہرانہ میں شرکت بھی کی اس دوران میں اُن کے کئی مہمانوں سے بھی ملا۔ ان ملاقاتوں میں مجھے نواز شریف کی شخصیت، افکار اور نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ میں جوں جوں اُن کے قریب ہوتا گیا، میاں صاحب کی محبت آمیز، مقناطیسی اور دل آویز شخصیت اور کردار کے مختلف پہلو مجھ پر کھلتے گئے۔ میں نے نواز شریف کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی سے حاکمانہ لہجے میں بات کرتے دیکھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی مکمل اور پرکشش شخصیت کے حامل ہیں۔

نواز شریف کے ملازمین کی ایک بڑی تعداد پاکستانیوں کی تھی۔ اور یہ اُن کے ساتھ پاکستان سے آئے تھے۔ مددگار اور معاون سرفراز، ضیاالحق، اشفاق، شکیل ،افضل، حامد اور بیگم حامد، نسیم مختار کے علاوہ عبدالغفار، غلام رسول، احمد، بشیر اور ندیم تربیت یافتہ خانسامہ تھے۔ وہ اکثر و بیشتر فرمائش پر بہترین کھانے تیار کر دیتے۔ ان سب کا تعلق پاکستان کے مختلف شہروں لاہور، نارووال، مانسہرہ سے تھا اور یہ وہاں پر فیملی ممبرز کی طرح ہی رہ رہے تھے ان سب نے خدمت اور فرمانبرداری کا حق ادا کر دیا۔ ضیاء الحق نے مجھے بتایا کہ نواز شریف کبھی ہم سے ناراض نہیں ہوتے اور اگر معمولی طور پر ناراض ہو بھی جائیں تو چند ہی لمحوں میں نارمل ہو جاتے ہیں اور ہم سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

ہر مہمان کو عربی قہوہ، کھجور اور عربی مٹھائی پیش کی جاتی تھی۔ نواز شریف کے دسترخوان کی وسعت اور اُن کی مہمان نوازی سے جن لوگوں نے لطف اُٹھایا ہے، وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ جلاوطنی میں بھی نواز شریف کے اسلوب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سیاہ فام خدمت گار چہرے پر مسکراہٹ سجائے مہمانوں کو مختلف پھل

(فواکہات) پیش کرتے۔ یہ لوگ خدمت کے جدید اور مہذب آداب سے پوری طرح آشنا تھے اور تربیت یافتہ تھے۔ پاکستانی خدمت گار سفید شلوار قمیض اور کالی ویسٹ کوٹ میں ملبوس ہوتے اور عربی خدمت گار سفید قمیض اور کالی پینٹ کے علاوہ کالے جوتے زیب تن کیے ہوتے۔ ظہر کے بعد اکثر مہمان رخصت ہو جایا کرتے۔ جو رکتے، وہ میاں صاحب کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔

ملاقاتوں کا دوسرا دور مغرب کی نماز کے بعد شروع ہوتا اور عشاء تک جاری رہتا۔ اس شام کی محفل میں مہمانوں کی تعداد پندرہ سے تیس تک ہوتی۔ اس دوران انفرادی اور اجتماعی گفتگو جاری رہتی نواز شریف اپنی مخصوص کرسی پر تشریف رکھتے اور وسیع ڈرائنگ روم میں لوگ اُن کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ میاں شریف صاحب اور میاں شہباز شریف صاحب بھی اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر موجود ہوتے۔ اس محفل میں پاکستانی اخبارات میں شائع ہونے والی اہم خبروں پر تبصرہ ہوتا۔ اہم کالم پڑھے جاتے ان کا تجزیہ کیا جاتا۔ خبریں اور کالم پڑھنے کے فرائض مختلف اوقات میں چوہدری قدرت عثمان، ڈاکٹر عدنان اور چوہدری خورشید ادا کرتے رہے۔ یہ نہایت دلچسپ محفل ہوتی تھی جس میں شریک ہونے والا خوش بھی ہوتا تھا اور بہت کچھ سیکھتا بھی تھا۔ اس محفل میں نواز شریف کی شخصیت چھائی رہتی تھی اور وہ تمام حاظرین کی نگاہوں کا مرکز بنے رہتے۔ گفتگو کے دوران پاکستان کی اُن غاصب قوتوں کے خلاف انقلاب برپا کرنے پر بات بھی ہوتی جنہوں نے نواز شریف کو اقتدار سے محروم کیا تھا اور اب وہ مختلف طریقوں سے میاں صاحب سے سلسلہ جنبانی کے متمنی تھے۔ نواز شریف محفل میں شریک لوگوں کی بات غور سے سنتے تھے درمیان میں کہیں بھی کسی کو نہیں ٹوکتے تھے۔ پھر ایک ہی فقرے میں بہت بڑی بڑی باتیں کہہ دیتے تھے۔

اُن کی خاموشی کئی بار اُن کے تبصرے سے زیادہ معنی خیز ہوتی۔ اُن کا چہرہ بظاہر سپاٹ ہوتا لیکن رازدان جانتے تھے کہ وہ کس موضوع سے خوش ہیں اور کونسی بات اُن کے مزاج پر گراں گزرتی ہے۔

شام کی ان مجالس میں شریک اگر کوئی صاحب نواز شریف صاحب سے براہِ راست سوال کرتے تو وہ مختصر اور اطمینان بخش جواب دیتے اور پھر اگلے سوال کا انتظار کرتے۔ نواز شریف انتہائی سلیقے سے بات کہہ جاتے۔ ظہر اور مغرب کی ان مجالس میں نواز شریف صاحب ضروری ٹیلی فون بھی سنتے۔ شام کی محفل میں تقریباً سبھی اہل خانہ موجود ہوتے تھے۔ میاں شریف صاحب ابتدائی دنوں میں چل کر بعدازاں ویل چیئر پر بیٹھ کر اس محفل میں شریک ہوتے۔ حسین نواز شریف، شہباز شریف، کیپٹن صفدر گفتگو میں حصہ لیتے۔ عباس شریف کبھی بھی گفتگو نہ کرتے اور چپ سادھے رکھتے۔ اس محفل کو رونق بخشنے والی ایک اور شخصیت سہیل ضیا بٹ ہیں جو نواز شریف کے قریبی عزیز بھی ہیں اور جانثار ساتھی بھی۔ وہ روزِ اوّل سے ہر لمحہ نواز شریف کے ہراول دستہ کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ جلاوطنی کے بعد اُن کے دو بھائی بھی پابند سلاسل رہے۔

میں نے اس محفل میں میاں محمد شریف صاحب کا جو احترام دیکھا ہے، وہ بے نظیر تھا اور بے مثال بھی لوگوں کے لیے مشعل راہ بھی تھا وہ اپنی وفات تک ان محفلوں کی جان رہے۔

شہباز شریف جس طرح اپنے بڑے بھائی کا احترام کرتے تھے اور اُن کی ہدایات کو اپنی پلکوں پر بٹھاتے تھے وہ قابل دید تھا۔ مختلف امور پر اختلافِ رائے

کے باوجود وہ محبت اور احترام کا دامن نہ چھوڑتے۔ ویسے بھی جناب شہباز شریف نے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک اولالعزم اور بہادر انسان ہیں۔ کوئی لالچ، خوف اور سازش انہیں گمراہ نہیں کرسکی اور نہ ہی انہیں اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں کھڑا کرنے میں کامیاب ہوسکی۔ انہوں نے نواز شریف کو اپنا بھائی، باپ اور قائد تسلیم کر رکھا ہے۔

عشاء کی آذان ہوتی تو حسین نواز شریف اسی مجلس میں باجماعت نماز کی امامت کرتے مہمان اور اہلِ خانہ مقتدیوں میں شامل ہوتے۔ یہ منظر بڑا دلنواز بھی ہوتا اور روح پرور بھی۔ حسین شاندار آواز میں قرات کرتے۔ وہ بہت خوش الحان ہیں نماز کے بعد بڑی پر درد دعا کرواتے۔

عشاء کی نماز کے بعد دستر خوان سجا دیا جاتا کھانے کے کمرے میں ایک لمبی میز اور اُس کے ارد گرد تقریباً تیس سے پینتیس کرسیاں رکھی ہوتیں۔ دستر خوان پر دنیا بھر کی نعمتیں بہار دکھا رہی ہوتیں۔ عربی اور پاکستانی باورچیوں کا تیار شدہ کھانا پیش ہوتا عربی کھانا مصری تیار کرتے اُن میں مشہود، ناصر اور احمد پسندیدہ تھے۔ اس کے علاوہ شاہی محل کے دو بھارتی مسلمان شیف بھی ہمہ وقت کھانا تیار کرنے کے لیے موجود ہوتے۔ مرغ، بکرے کے گوشت، مچھلی، سبزیاں، دالوں، چاول، نان، چپاتی اور دیگر اشیا پر مشتمل پر تکلف کھانا اور پھر اُس کے بعد تین یا چار طرح کی سوئٹ ڈش پیش کی جاتی۔ کھانے کے دوران نواز شریف اور مہمان گفتگو کرتے رہتے مگر نواز شریف خصوصی طور پر ہر مہمان کو مختلف کھانے کھلانے پر اصرار کرتے اور کبھی کبھار ملازمین کو اشارے سے مہمان کی پلیٹ پُر کرنے کا عندیہ دیتے۔ مشروبات کے ساتھ خصوصی دہی کی لسی (لبن) بھی پیش کی جاتی۔ کھانے کے بعد انواع و

اقسام کے پھل رکھے جاتے تو نواز شریف پاکستانی آموں اور کنو کی تعریف کرتے اور پھر دنیا کے مختلف پھلوں کے بارے میں بات شروع کر دیتے وہ پھلوں کے بارے میں بھی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ میں نے کئی پھل زندگی میں پہلی بار اُن کے ساتھ چکھے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مجھے سری لنکا سے آیا ہوا پھل مینگسٹو اور جنگلی بیر کھلائے جو بہت لذیز تھے۔ انہوں نے یہ پھل خصوصی طور پر ملازم سے کہہ کر اپنے رہائشی فلور سے منگوائے تھے اس کے علاوہ انہوں نے درجن بھر اجنبی پھلوں کے نام اور ذائقے بھی گنوائے جس سے مجھے حیرت ہوئی۔

کھانا کھانے کے بعد نواز شریف مسکراتے ہوئے ملازمین سے کہتے کہ اب میری ڈائٹ فوڈ لے آؤ اُس کے بعد ہم سب بھی اس سے محظوظ ہوتے۔

کھانے کے بعد کسی بھی باریش مہمان سے دعا کرائی جاتی میں مولانا سمیع الحق، مولانا فضل الرحمٰن، حافظ حسین احمد، مولانا جمیل احمد شرقپوری، پیر صاحب آف بھیرہ شریف اور دیگر کئی علمائے کرام کی اس دعا میں شریک ہوا ہوں۔ اس کے بعد نواز شریف مہمانوں کو محل کے مین دروازے تک آ کر الوداع کرتے اور تقریباً گیارہ بجے رات اپنی آرام گاہ میں تشریف لے جاتے۔

جدہ میں آمد کے ساتھ ہی میاں شریف صاحب نے حکم صادر کیا تھا کہ وہاں پر بھی کاروبار کا آغاز کیا جائے اور پھر اُن کی نگرانی میں جدہ اور مکہ کے درمیان بحیرہ نامی ایک قصبے میں سٹیل مل لگانے کا آغاز ہوا۔ کچھ کرنے کا جنون میاں شریف صاحب کو بے قرار رکھتا تھا اور وہ ہر پل کچھ نہ کچھ کرنے پر مائل رہتے تھے۔ پیرانہ سالی اور کمزور صحت کے باوجود انہوں نے خود نئی فیکٹری ڈیزائن اور مکمل کی۔ اس

کاروبار کی دیکھ بھال میں سب سے اہم کردار جناب حسین نواز شریف کا تھا اور اُن کی معاونت کے لیے کیپٹن صفدر ہمہ وقت اُن کے ساتھ تھے۔

شاید یہ نواز شریف کی جلاوطنی کا تیسرا سال تھا جب ان کے سابقہ ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر ریٹائرڈ جاوید ملک بھی جدہ آ کر نواز شریف کے عملہ میں شامل ہو گئے وہ نواز شریف کے انتہائی بااعتبار اور وفادار ملٹری سیکرٹری تھے۔ جس روز فوج نے نواز شریف کا تختہ اُلٹا بریگیڈیئر جاوید کو ٹیلی ویژن سٹیشن کا کنٹرول لینے بھیجا گیا۔ مگر وہ بعدازاں گرفتار کر لیے گئے ان کا فوجی ٹرائل ہوا اور جبری طور پر ریٹائر کر دیے گئے رہائی کے بعد وہ بھی جدہ آ گئے۔

سرور پیلس میں نواز شریف صاحب کی خدمت پر معمور عملہ کی تعداد تقریباً ستر افراد پر مشتمل تھی سیکورٹی ملازمین کی تعداد چھبیس تھی اور ان کا انچارج کا شاہی گارڈز (حرس الملکی) کا کپتان (نقیب) تھا۔ اس کا نام احمد الھویدی تھا اس کے علاوہ معاذن، احمد اور سالم وغیرہ بھی اُس کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ تربیت یافتہ کمانڈوز اور جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ زیادہ تر اسلحہ چھپا کر رکھتے تھے اور موقع محل کی مناسبت سے وردی یا مقامی سعودی لباس پہنتے تھے نواز شریف سے پہلے بھی سعودی حکومت نے کئی سابق حکمرانوں کو اپنے ہاں پناہ فراہم کی تھی لیکن نواز شریف کو جو پروٹوکول فراہم کیا گیا تھا اُس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حفاظتی عملہ باری باری نواز شریف کے ساتھ ہر موقع پر موجود ہوتا۔ حتیٰ کے عمرہ یا مدینہ میں حاضری کے دوران بھی سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہتا۔ اس کے علاوہ مین گیٹ اور محل کی عمارت کے اردگرد موجود سیکورٹی گارڈز کا تعلق رائل آرمی سے تھا وہ آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح ہوتے اور محل کے علاوہ آنے جانے والے افراد پر بھی نگاہ رکھتے۔

دیگر سٹاف میں بیرے، سویپر اور دفتری عملہ شامل تھا۔ دفتری کاموں کے لیے چار سے پانچ افراد موجود تھے۔ خط و کتابت کرنا، فون سننا، ای میل وصول کرنا اور جواب دینا، پاکستان میں لوگوں سے رابطہ رکھنا، ضرورت مندوں کے مسائل حل کرنا اور اعانت فراہم کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ مولانا زاہد اور معروف قاری شکیل احمد صدیقی بھی محل میں آنریری حیثیت میں کام کرتے رہے۔ قاری شکیل احمد تقریباً گذشتہ تیس برس سے مجموم مسجد علاقہ بلد میں امام کی حیثیت سے فرائض ادا کر رہے ہیں ساہیوال سے تعلق ہے نواز شریف کے جیالے ہیں متوالے ہیں اور اُن کے ذاتی کاموں کی نگرانی اُن کے ذمہ ہے۔ وہ ایک محبّ وطن پاکستانی اور وفادار دوست ہیں۔

جدہ پہنچتے ہی سعودی حکومت نے جناب نواز شریف کو چھ عدد جدید ترین اور مہنگی مرسیڈیس S-600 ماڈل کی کاریں پیش کیں تھیں اور ایک گاڑی کی قیمت تقریباً پانچ لاکھ ریال تھی۔ جن پر حکومت سعودیہ کا خصوصی نشان بھی کندہ تھا۔ تاکہ اُن کی بطور وی۔آئی۔پی شناخت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ کچھ عرصہ بعد نواز شریف صاحب نے ایک کار رکھ کر باقی شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں اور چھ برس تک یہی کار اُن کے زیرِ استعمال رہی اور رائل پروٹو کال (مراسم الملکی) کا ڈرائیور خالد المطیر ی اُن کے ساتھ ڈیوٹی کرتا رہا میں نے اُس سے کئی بار گفتگو کی تو ہمیشہ اُسے نواز شریف کا معترف پایا وہ اُن کی سادہ دلی اور انسانیت دوستی پر قربان تھا پہلی بار جب میرا اُس سے تعارف ہوا تو میں نے اُس کا نام دریافت کیا اُس نے مجھ سے میرا نام دریافت کیا اور پوچھا کہ میں کون ہوں میں نے جواب دیا کہ میں نواز شریف صاحب کا ایک دوست اور بھائی ہوں تو وہ عربی میں بولا (رفیق رئیس زے رئیس) جس کا مطلب

ہے کہ حکمران کا دوست بھی حکمران ہوتا ہے میں ہنسا اور شکریہ ادا کر کے چل دیا۔
نواز شریف کے ساتھ سیکورٹی ڈیوٹی کرنے والے تمام اہلکار اُن پر دل و جان سے فدا
تھے کیونکہ نواز شریف نہ صرف اکثر و پیشتر اُن سے حال واحوال پوچھتے بلکہ اُن کے اہل
خانہ کے بارے میں بھی دریافت کرتے اُن کو انعام کے طور پر تحائف بھی بھجواتے
رہتے۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اُن گارڈز نے کہا کہ ہم ہمیشہ نواز شریف کو اپنی
دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں وہ ایک انسان دوست شخصیت ہیں۔

پسندیدہ کھانے اور مشروب

ایک دن یونہی قریباً قبل از دوپہر گیارہ بجے میں نواز شریف صاحب کے دفتر میں اُن سے محو کلام تھا تو باتوں باتوں میں اُن کے پسندیدہ کھانوں کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ کیا آپ سری پائے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ بولے: ''جی نہیں مجھے تو بالکل سری پائے کھانے کا شوق نہیں ہے اور میں ہر طرح کا کھانا کھالیتا ہوں۔ ناشتے میں میں صرف کشمیری چائے یا کافی استعمال کرتا ہوں۔ دوپہر کو بھی تقریباً کھانے سے پرہیز ہی کرتا ہوں۔ مہمان ہوں تو ظہرانے میں شریک ہو جاتا ہوں اور رات کا مکمل کھانا کھاتا ہوں۔ مجھے اچھے بنائے ہوئے کھانے پسند ہیں اور میں لوگوں کو کھلا کر خوش ہوتا ہوں۔ دنیا بھر سے میرے دوست مجھے جدہ کھانے پینے کی اشیاء بھیج دیتے ہیں لاہور سے دوست لاہوری کھگے اور دیگر کشمیری ڈشیں بنا کر بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کر دیتے ہیں۔''

میں نے اُن سے پوچھا آپ کے بارے میں تو کھانے کے حوالے سے بہت سی روائتیں مشہور ہیں وہ بولے: ''بس ایسے ہی مشہور ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

جدہ کے سرور پیلس میں ظہرانے اور عشائیے میں مہمانوں کے لیے نواز شریف کی پسند پر تقریباً ہر روز دس سے پندرہ قسم کے کھانے تیار کر کے پیش کیے جاتے۔ کبھی کبھار شیف کو بھی کھانے کے دوران طلب کر لیا جاتا تھا۔ کھانوں کی تیاری کے طریقے اور مصالحوں وغیرہ پر سوال کیے جاتے۔ کھانے کے بعد انواع واقسام کے پھل موجود ہوتے۔ تین سے چار قسم کی سوئٹ ڈش پیش کی جاتی۔

This page is empty

بادشاہ نواز شریف کہنے والی، زین ضیاء

نواز شریف کی سیاست کا آغاز پنجاب کی وزارتِ خزانہ سے ہوا۔ صوبہ پنجاب کے وزیرِاعلیٰ اور پھر پاکستان کے دو بار وزیراعظم بنے۔ وہ لمبے عرصہ تک اقتدار سے منسلک رہے لیکن اُن کے سینے میں اقتدار کے حصول کی تڑپ نہیں تھی بلکہ وہ ایک نرم دل اور محبت کرنے والے شخص کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بھائی نے اقتدار کے لیے بھائی کا سر قلم کیا۔ بھائیوں کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ بھروایا۔ تخت کی خاطر بھائی کی آنکھیں نکال دیں، نیک بیٹے نے باپ کو قلعے میں تاحیات قید رکھا اور باپ نے بھی بیٹے کو پھانسی دی یہ سب کچھ اقتدار کے کھیل میں ہوتا رہا۔

لیکن میں ایسے نواز شریف کو جانتا ہوں جو پرانے تعلقات اور رشتے نبھانا جانتا ہے، جس کی آنکھ میں شرم وحیا چمکتی ہے جو اقدار اور روایات کا پاسدار ہے محبت کا امین ہے اور جو گزرے دنوں کے دوستوں کی بے وفائی کے باوجود انہیں محبت اور احترام سے خوش آمدید کہنا جانتا ہے۔ وہ کسی کی غیر موجودگی میں اُس کے خلاف بات نہیں کرتا اور نہ ہی پشت پر وار کرنے کی سازش پر یقین رکھتا ہے۔

ایک دفعہ شہید جنرل ضیاء الحق کے صاحبزادے اور وفاقی وزیر برائے مذہبی اُمور اعجاز الحق سعودی عرب دورہ پر تھے اُن کی اہلیہ اور چھوٹی ہمشیرہ محترمہ زین ضیاء بھی ہمراہ تھیں وہ عمرہ کے لیے ابھی جدہ میں قیام پذیر تھے میں بھی وہیں تھا مجھے مسعود پوری صاحب نے فون پر مطلع کیا کہ یہ سب لوگ جدہ میں ہیں تو میں نے کہا کہ انہیں نواز شریف صاحب سے ملنا چاہئے اور اس سے پہلے کہ میں یہ واقعہ قارئین کرام کی

خدمت میں پیش کروں میں چاہتا ہوں مسعود پوری صاحب کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔ وہ دراصل چنیوٹی شیخ ہیں۔ گذشتہ تیس سال سے جدہ میں وسیع کاروبار ہے نواز شریف کے عاشق مسلم لیگی ہیں عرصہ دراز سے اکابرین مسلم لیگ کی مہمانوازی کا شرف انہیں حاصل ہے۔ وہ اور قاری شکیل صدیقی سیاسی سرگرمی دکھاتے ہوئے جدہ میں گرفتار ہوئے 'ترحیل' نامی جیل میں مہمان رہے مگر نواز شریف کی مداخلت پر ڈی پورٹ ہونے سے بال بال بچ گئے۔

مسعود پوری صاحب کا اعجاز الحق کے بارے میں فون آیا تو میں اُن سے ملاقات کے لیے حیات ریجنسی ہوٹل پہنچ گیا۔ زین ضیاء بھی وہیں تھیں انہوں نے مخصوص لہجے میں مجھے کہا: ''سعید الٰہی کیا حال ہے'' زین شہید جنرل ضیاالحق کی لاڈلی صاحبزادی ہیں۔ جنرل ضیاء اُن سے خصوصی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ نواز شریف بھی اُن سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ زین ضیاء نواز شریف کو عرصہ دراز سے جانتی ہیں اور وہ نواز شریف کو ہمیشہ 'بادشاہ' کہہ کر پکارتی آرہی ہیں۔ نواز شریف جب وزیر سے وزیراعظم بن گئے تب بھی زین انہیں 'بادشاہ' ہی کہتی تھیں۔ اب جدہ میں نواز شریف جلاوطن تھے، تب بھی وہ انہیں 'بادشاہ' کے نام سے پکارتی تھیں۔ میرا حال پوچھنے کے بعد زین نے کہا: ''بادشاہ' کہاں ہے کیا وہ جدہ میں ہی ہے'' میں نے اثبات میں جواب دیا وہ خوش ہوئیں اور کہا: '''بادشاہ' سے ملنا چاہتی ہوں''۔

اُسی شام میں جناب نواز شریف کے پاس آیا اپنی اس ملاقات کا احوال انہیں سنایا۔ اور زین ضیاء کی خواہش بھی گوش گزار کردی۔ میاں صاحب خاموش ہوگئے اور مجھے تکنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ زین ضیاء کو دعوت دینی چاہیے، اور اگر

ممکن ہو تو اعجاز الحق صاحب کو بھی ملاقات کا وقت دے دیجئے۔ میری ساری باتیں وہ خاموشی سے سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دیا میں شام کی محفل کے خاتمہ پر واپس آ گیا۔ دوسرے روز مجھے قاری شکیل صدیقی کے ذریعے معلوم ہوا کہ بیگم کلثوم نواز شریف صاحبہ نے زین ضیاء کو دعوت دی ہے اور انہیں کھانے کے لیے سرور پیلس میں مدعو کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نواز شریف سہی معنوں میں شریف اور وضع دار آدمی ہیں۔ اُن کی شرافت اور بڑائی اس امر سے عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے زین کو گھر بلایا کھانا کھلایا اور اُن کے ساتھ وقت گزارا۔ پھر اپنے ساتھ محل میں رہنے کی دعوت بھی دی مجھے معلوم ہوا کہ واپسی پر انہیں قیمتی تحائف سے بھی نوازا۔ خاندان کے بچوں نے ان سے گپ شپ لڑائی، وہ میاں شریف کی خدمت میں بھی حاضر ہوئیں۔ بیگم کلثوم نواز صاحبہ نے بھرپور محبت اور احترام دیا۔

اعجاز الحق صاحب سے ملاقات کے حوالے سے میں نے جو گزارشات کی تھیں نواز شریف اُس بارے میں خاموش رہے تھے اور ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہ دیا تھا۔ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ میری اس بات پر ایک افسردگی سی ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئی تھی شاید اپنے ایک دوست اور بھائی کی بے وفائی کے غم نے انہیں افسردہ کر دیا تھا۔

چند ہی روز بعد وہ حرم مکہ میں اعجاز الحق سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ بیٹھا کر افطاری بھی کروائی اس سے مجھے خوشی ہوئی کہ نواز شریف کی ذات کے اندر ایک نفیس اور اعلیٰ کردار کا مظہر انسان زندہ ہے۔

This page is empty

ہر دلعزیز لیڈر کیسے بنا؟

جدہ کے سرور پیلس کا اپنا ہی انداز اور سرور ہے۔ جن لوگوں نے اسے اندر سے نہیں دیکھا، وہ اس کی وسعت، خوبصورتی اور دلکشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ ترک طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ تقریباً نصف صدی قدیم ہے مگر آرائش نو کے بعد کسی بھی جدید محل سے کم نہیں (اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے) ایک روز میاں نواز شریف حسبِ معمول اچھے موڈ میں تھے میں نے موقع غنیمت جانا اور اُن سے پوچھا: ''میاں صاحب بعض لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو کی طرح فوج کے بنائے ہوئے ایک لیڈر ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

نواز شریف جو کہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے انہوں نے تحمل سے میرا سوال سنا اور اس کا جواب تفصیل سے دیا: ''بناتا کوئی نہیں ہے، یہ محض ایک بہانا ہوتا ہے جس میں بعدازاں لوگ فسانہ طرازی کر کے، اس میں اپنی خواہشوں کے رنگ بھر کر کہانی بنا لیتے ہیں اور پھر اسے ہی مستند قرار دیتے ہیں۔ ہر زمانے میں حالات مختلف ہوتے ہیں جنہیں انسان اپنی عقل، شعور اور محنت سے استعمال کرتا ہے۔ مجھے کسی نے اگر کامیاب اور ہر دلعزیز راہنما بنایا ہے تو وہ صرف اللہ کریم کی ذاتِ پاک ہے باقی صرف داستانیں ہیں۔ پاکستان کے بارے میں میری سوچ واضح اور عیاں ہے یہ ہمیشہ مثبت اور وطن کی محبت سے سرشار رہی ہے۔ میں نے اسے بارہا ثابت کر کے دکھایا ہے۔ کامیابی کے لیے سعی مسلسل لازم ہے۔'' ماضی قریب کے چند اوراق پلٹتے ہوئے کہا: ''1992ء میں میری اصل سیاسی شخصیت نکھر کر سامنے آئی اور مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک ہر دلعزیز شخص ہوں اور عوام کی ایک بہت بڑی تعداد مجھے چاہتی

ہے میرے افکار وخیالات کو ان کی تائید حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صدر غلام اسحاق خان میرے خلاف سازشوں کا جال بن رہے تھے اور میرے پاؤں تلے سے زمین کھینچنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مقتدر قوتیں بھی اُن سے الحاق کر چکی تھیں۔ صدر غلام اسحاق خان نے وار کیا اور میری حکومت کا خاتمہ کر ڈالا لیکن میں نے ایک عزم صمیم کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کو للکارا اور ان طاغوتی طاقتوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ میرا ردِعمل اتنا شدید ہوگا اور میں اُن کے عزائم کے سامنے دیوار بن جاؤں گا۔"

نواز شریف کہہ رہے تھے: "میرے خلاف تین طاقتور افراد نے اتحاد قائم کر لیا تھا۔ یہ ٹرائیکا مجھے ایوانِ اقتدار سے رخصت کر کے خود اس پر قابض ہونا چاہتی تھی اور اپنے مخصوص مفادات اور ایجنڈے کی تکمیل اُس کے عزائم میں شامل تھی۔ ایک طرف صدرِ پاکستان غلام اسحاق خان تھے، اور دوسری طرف چیف آف آرمی سٹاف!! اور تیسری طرف قائد حزب اختلاف۔ ان تینوں کے مقابلے میں میں تنہا تھا لیکن میں نے خود کو کمزور نہ سمجھا۔ خدا کے بعد پاکستان کے محبّ وطن عوام میرے ساتھ تھے اور میں نے اُن کے دل پر دستک دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ سازشی بے نقاب ہوں عوام اصل حقائق سے آگاہ ہوں اور وہ ظالم کے خلاف مظلوم کے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔" نواز شریف نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا: "پنجاب میں منظور احمد وٹو صاحب کے ذریعے میرے خلاف بغاوت کرا دی گئی تھی تاکہ مجھے اپنے ہی گھر کے اندر محصور کیا جا سکے اور اپنے صوبے کی طاقت سے محروم کر دیا جائے لیکن میں اس سے پریشان نہ ہوا اور اپنے حواس قابو میں رکھے۔ میں سارے پاکستان کو اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔ صرف پنجاب ہی میرا گھر اور صوبہ نہیں ہے بلکہ

سندھ، سرحد اور بلوچستان بھی مجھے یکساں عزیز ہیں اور وہاں کے عوام بھی مجھے محبت اور احترام سے نوازتے ہیں۔ میں نے صدر پاکستان، قائد حزب اختلاف، چیف آف آرمی سٹاف اور وفاداریاں تبدیل کرنے والے بے راہ عناصر کی سوچوں اور منصوبوں کے برعکس عوام کے سامنے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسی وجہ سے میں کسی کے دباؤ میں نہیں آیا۔ مجھے قدم قدم پر اللہ تعالیٰ ہمت سے نواز رہا تھا اور میری پارٹی کے جانثار ساتھی چاروں صوبوں میں میرے ہم قدم اور ہمنوا تھے"۔

میرا سوال مختصر سا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے نواز شریف آج اس سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ دینا چاہ رہے تھے اور اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے: "میں نے ٹرائیکا کے خلاف ٹرین مارچ کا فیصلہ کیا اور اس کو مکمل کیا پورے ملک کا دورہ کیا لوگوں نے مجھے جگہ جگہ پیار سے نوازا پیار سے چوما، میرے ہاتھوں کو بوسے دیے تاحد نظر انسانوں کے ہجوم نے والہانہ استقبال کیا جس سے مجھے احساس ہوا کہ مقتدر ٹرائیکا کو للکارنا ہی لوگوں کے دل کی آواز ہے لوگ یہی چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں انہی دنوں ہر دلعزیز راہنما اور سیاستدان بنا اور عوام میں میری مقبولیت کی جڑیں دور دور تک سرایت کرتی گئیں۔

یہ میری اصل سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔ اس دوران میرے مخالفین کی حکومت آئی تو ہمارے خلاف انتقامی کاروائیوں کا آغاز ہوا مخالفین کا یہ دعوی تھا کہ نواز شریف کے لیے تو ایک ایکسائز انسپکٹر ہی کافی ہے اور وہی اُن کو راہِ راست پر لے آئے گا۔ لیکن میں نے اپنے کردار اور افعال سے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے میرے مخالفین پریشان بھی ہوئے اور حیرت زدہ بھی۔ اس جدوجہد نے مجھے، میرے ساتھیوں اور میری پارٹی کو مضبوط کیا۔ حوصلے بلند ہوئے مشکلات کٹنے لگیں۔

صاف نظر آنے لگا کہ ہم ایک بار پھر اقتدار میں ہونگے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر انتخابات شفاف ہوئے تو ہماری جیت یقینی ہے اور جب صدر غلام اسحاق خان نے ہمارے بعد بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت کا خاتمہ کیا تو ہماری کامیابی اور بھی واضح اور روشن ہونے لگی۔''

دوبار پاکستان کے وزیراعظم رہنے والے میاں نواز شریف بتا رہے تھے:

''1996ء میں انتخابات ہوئے تو ہماری تین سالہ سیاسی جدوجہد رنگ لائی۔ اللہ کے فضل وکرم سے عوام نے ہمیں بھاری اکثریت سے کامیاب کرایا، ہماری پارٹی اور نعروں پر اعتماد کیا ہم دو تہائی اکثریت لے کر پارلیمنٹ میں پہنچے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے روشن اور پرامید دن تھے ہم عوام کے شکرگزار تھے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ محبتوں سے ہمیں مالامال کردیا تھا لیکن ہم کامیابی کے نشے میں مدہوش نہ ہوئے بلکہ ہرلمحہ کوشش کی کہ دیانتداری سے فیصلے کریں عوام کی فلاح کے لیے دن رات محنت کریں کیونکہ ہمیں خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ میں یہ بات خصوصی طور پر کہنا چاہوں گا کہ مجھے اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل تھی میں نے اسی عوامی طاقت کے بل پر آٹھویں ترمیم کا خاتمہ کیا اس کے باوجود اسلام آباد میں موجود بہت سی ایسی قوتیں تھیں جو عوام کی بہتری کے لیے کیے گئے فیصلوں کی راہ میں بار بار رکاوٹ بن رہی تھی۔ یہ پراسرار لوگ اور مقتدر قوتیں عوام کے سامنے آنے سے گریز کرتی ہیں کیونکہ ان کے فیصلے عوام کے حق میں نہیں ہوتے اُن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور مخصوص ایجنڈا اُن کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ کوئی عوامی نمائندہ ایسا فیصلہ کرے یا ایسا قدم اُٹھائے جس سے اُن کے اور اُن کے غیرملکی آقاؤں کے مفادات پر زد پڑے۔ یہ قوتیں

میرے خلاف، میرے ہر راستے میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کرتی تھیں لیکن میں اللہ کے فضل وکرم سے ان رکاوٹوں کو عبور کرتا رہا۔''

نواز شریف کہتے ہیں: ''یہی وہ منحوس قوتیں تھیں جو میری خوابوں کی راہ میں رکاوٹ تھیں میں پاکستان کو جدید ریاست بنانا چاہتا تھا اسے بہت آگے لے جانا چاہتا تھا۔ نئی اور جدید ٹیکنالوجی کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا تھا میں پاکستان کو ایک کامیاب اور کامران ملک بنانے کا عہد کیے ہوئے تھا لیکن سازشی بھی مورچہ زن تھے اور پاکستان کو اپنی خواہشوں کا قیدی رکھنے کے درپے تھے۔ ہم نے مشکلات کے باوجود موٹروے تعمیر کی۔ اپنا گھر سکیم بنائی تاکہ مستحق اور بے گھر لوگوں کو رہائش مل سکے۔ سڑکوں کا جال بچھا کر ملک کو خوشحالی سے ہمکنار کیا ہمسایہ ممالک سے بہترین دوستانہ تعلقات قائم کیے تاکہ معاشی ترقی تیز ہو سکے' اور پھر نواز شریف نے حسبِ عادت شہادت کی انگلی اُٹھا کر کہا: ''ہم نے پاکستان کو مضبوط، مستحکم اور ناقابل شکست بنانے کے لیے ایٹمی دھماکہ کیا اور اسے دنیا کے سات ایٹمی قوت کے حامل ممالک میں شامل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تین سال میں وہ کام کر دیے جو گزشتہ پچاس برس میں نہیں کیے گئے تھے۔ ہماری حکومت ختم کر دی گئی اور ہمیں جلاوطنی کا غم بھی سہنا پڑا لیکن ہم نے اس ظلم، استحصال اور زیادتی کے باوجود اُن قوتوں سے سودے بازی نہیں کی جو میرے، میری حکومت اور میرے اہل خانہ کی نہیں بلکہ پاکستان اور اُس کے عوام کی بھی خیر خواہ نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور ملک کو پھر پچاس سال پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ 12 اکتوبر 1999ء کا دن تاریخ پاکستان میں صرف اس لیے یاد نہیں رکھا جائیگا کہ اُس روز میری حکومت کا خاتمہ کیا گیا بلکہ یہ روزِ سیاہ اس لیے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائیگا کہ اُس روز ایک مٹھی بھر گروہ نے

اکثریت کے حقوق کو پامال کر دیا تھا۔“

نواز شریف کا حافظہ بھی پوری طرح اُن کا ساتھ دے رہا تھا اور اُن کا اسلوب بھی جاذبِ دل تھا وہ کہہ رہے تھے: ”میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جس طرح اسٹیبلشمنٹ کو للکارا ہے اصولوں پر سودے بازی سے انکار کیا ہے عوام کے آئینی حقوق کے لیے جو اصول اپنائے ہیں، اُس نے مجھے مقبولیت سے ہمکنار کیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حقیقی قائد بننے کے لیے کیا کیا قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے میں اُسی موقف اور نظریے پر قائم ہوں جس پر آج سے چھ سال قبل قائم تھا۔ آج پاکستان کے عوام کی اکثریت میرے ساتھ ہے۔ سیاسی پارٹیاں بھی میرے ساتھ ہیں وہ پارٹیاں جن کی جڑیں عوام میں ہیں۔ لوگ مجھے اس لیے پیار کرتے ہیں کہ میں نے جو عہد کر رکھا ہے وہ انہیں بھی عزیز ہے اور وہ ہے پاکستان سے محبت اور اس کی تعمیر و ترقی۔ عوام نہیں چاہتے کہ فوج حکومت میں مداخلت کرے اور آئین کو پامال کرے میں نے بھی یہی نعرہ لگایا ہے کہ آئین کی بالادستی قائم کروں گا قومی اور سیاسی امور کے بارے میں متفقہ فیصلے کیے جائیں گے۔ یہ بات فوج کو منظور نہیں اور یہی وجہ اختلاف ہے۔ اسٹیبلشمنٹ نہیں چاہتی کہ سیاسی جماعتیں متحد ہو کر ملکی فیصلے کریں وہ فیصلے جو قوم اور ملک کے بہترین مفاد میں ہوں۔ یہ لوگ ابھی تک سامراجی نظام پر عمل درآمد کرتے ہوئے تقسیم کرو اور حکومت کرو کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا یہی میرا ایجنڈا ہے اور یہی میری خواہش۔ اسی نے مجھے پاکستان کے طول و عرض میں عزت بخشی ہے اسی نے مجھے لیڈر بنایا ہے اور وہ لوگ جو وردی والوں کے ”فرنٹ مین“ ہیں اُن کا مقام کیا ہے؟ ملک کے اندر اور باہر اُن کی عزت کیا ہے؟ یہ بیچارے پپٹس ہیں اور وہ بھی اُن ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے جنہوں نے

آئین کو پامال کرنے کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ایجنڈا کیا ہے۔ ظالموں کے اشاروں پر رقص کرنے والوں کا انجام نوشتہ دیوار ہے اور قریب بھی۔ یہ مصنوعی نظام اور مصنوعی لیڈر ختم ہونے والے ہیں۔ میں نے چند بنیادی اصولوں پر مشتمل ایجنڈا تیار کیا ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کے تمام اہم سیاسی لیڈروں سے رابطہ کیا ہے تاکہ متفقہ طور پر ایک بات طے کر لی جائے کہ ملک کی سیاست میں فوج کا کوئی کردار نہیں ہے۔ پاکستان تاقیامت قائم ودائم رہے گا مگر انشاء اللہ مستقبل میں فوج سیاسی کام میں مداخلت نہیں کر سکے گی۔

This page is empty

موٹروے کی تعمیر پر مؤقف : مقاصد کیا تھے؟

میاں محمد نواز شریف کے دورِ اقتدار میں جو یادگار کام کیے گئے۔ اُنہیں اُن کے دشمن اور دوست سب ہی تسلیم کرتے ہیں اُن میں ایک اہم کارنامہ موٹروے کی تعمیر ہے جس کے آغاز اور پھر تکمیل پر اس کی بازگشت سارے جنوبی ایشیا میں سنائی دی۔ نواز شریف نے اپنی دوسری وزارت عظمیٰ کے دور میں موٹروے کی تکمیل کر کے تاریخ میں اپنا نام رقم کیا اور بجا طور پر اکیسویں صدی کے ''شیر شاہ سوری'' کہلائے۔ اس موٹروے کا نام (M-2) ہے اور یہ اسلام آباد کو لاہور سے ملاتی ہے۔ اس کی کل لمبائی 380 کلومیٹر تھی اور یہ تین رویہ شاہراہ ہے۔ موٹروے کی تعمیر نے پاکستان کو دنیا بھر میں منفرد مقام عطا کر دیا۔

ایک روز میاں نواز شریف جدّہ میں اپنے محل کے اندر، اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے تھے۔ موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ موسم بہت گرم تھا لیکن محل کے اندر تیز اور طاقتور ائیر کنڈیشنگ کی وجہ سے ماحول سرد اور سکون آور تھا۔ نواز شریف بہت زیادہ ٹھنڈک پسند نہیں کرتے اس لیے جونہی درجہ حرارت زیادہ کم ہوا تو انہوں نے ملازم کو بلا کر ایئر کنڈیشنگ کم کرنے کے لیے کہا۔ میں اُن کے ساتھ ہی ایک نشست پر بیٹھا تھا اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اور سرخی نمایاں تھی۔ میں اُن سے ملاقات سے پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ میاں صاحب سے دو چار اہم موضوعات پر گفتگو کروں گا۔ چنانچہ انتظار کیے بغیر جلدی میں پوچھا ''جناب میاں صاحب، لوگ سوال کرتے ہیں کہ پاکستان جیسے غریب ملک کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ موٹروے تعمیر کرتا، اربوں روپے خرچ کر کے پاکستان کو کیا فائدہ ہوا''؟

اُنہوں نے میرا سوال تحمل سے سنا اور پھر نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے ''جدید دنیا میں جتنی بھی ترقی دیکھنے میں آرہی ہے، اُس میں موٹرویز نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ سب سے پہلے موٹروے جرمنی میں بنائی گئی تھی جس نے ترقی اور روزگار کے دروازے کھول دیے تھے اور نقل و حرکت ہی سے برکت ہوتی ہے۔ میں تو اپنے پہلے دور ہی میں موٹروے مکمل کرنا چاہتا تھا لیکن ہماری حکومت ختم کر دی گئی۔ موٹروے کی تعمیر کا کام سست روی اور بے دلی کا شکار ہو گیا۔ سیاسی مخالفین نے اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا''۔ نواز شریف اچانک درمیان میں رکے جیسے انہیں کوئی بات یاد آ گئی ہو اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے : ''اگر آپ کو یاد ہو، جب سو سال قبل امریکہ میں موٹرویز کا جال پھیلانے کا فیصلہ کیا گیا تو وہاں بھی اس کی بے پناہ مخالفت ہوئی تھی لیکن منصوبہ ساز اپنے فیصلہ پر ڈٹ گئے اور قدم روکنے سے انکار کر دیا اس کا نتیجہ پوری دنیا دیکھ رہی ہے،...... بہرحال 1996ء میں ہم لوگ جب دوبارہ اقتدار میں آئے تو میں نے موٹروے کے منصوبے کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اس کی نگرانی کی اور 27 نومبر 1997ء کو اس کا افتتاح کر دیا۔ میری نیت تھی کہ (M-2) کے علاوہ ملک کے سارے اہم شہروں کو موٹروے سے منسلک کرنے کے لیے (M-1) اور (M-3) کے ساتھ ساتھ (M-4) اور مزید شاہراہیں بھی مکمل کی جاتیں اور پاکستان کو اس کی وجہ سے دنیا کے بہترین اور ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل کر دیا جاتا۔ اس مقصد کے لیے میں اس موٹروے کو براستہ افغانستان، وسط ایشیا کی نو آزاد ریاستوں تک لیجانا چاہتا تھا اس طرح پاکستان ایک پل کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا۔ سرمایہ کاری بھی ہوتی اور مزید ترقی کے راستے بھی کھلتے چلے جاتے۔ میرا خیال تھا کہ یہ عظیم منصوبہ پانچ سے سات سال میں مکمل ہو جائے

گا۔ میں اسے چار رویہ بنانا چاہتا تھا مگر ہمارے بعد کی حکومت نے اسے تین رویہ بنانے کا فیصلہ کیا میں نے کسی بھی تبدیلی کے بغیر اسی منصوبے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ میں اب دوبارہ کسی رکاوٹ کے نتیجے میں یہ کام روکنا نہیں چاہتا تھا'' وہ تھوڑی دیر رک کر کہنے لگے: ''اللہ کے فضل و کرم سے یہ منصوبہ مکمل ہوا۔ کامیاب ہوا اور اس سے میرے حامی اور مخالف سبھی مستفید ہو رہے ہیں۔ سفر کی مشکلات اور وقت میں کمی ہوئی ہے اور لوگ اس سے خوش ہیں''۔

میاں محمد نواز شریف گفتگو کرتے ہوئے خاصے جذباتی ہو گئے تھے۔ وہ موٹروے کا تذکرہ ایسے والہانہ انداز میں کر رہے تھے جیسے اپنی کسی عزیز ترین متاع کا ذکر کر رہے ہوں۔ میں نے پوچھا بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس موٹروے کی تعمیر کے لیے آپ نے ملک کے بنک خالی کر دیے۔ چالیس ارب روپے کا خطیر سرمایہ صرف کیا۔

کہنے لگے'' جب ایک آدمی عمر بھر ملازمت کے بعد ریٹائر ہوتا ہے اُسے خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔ یہ پیسے بنک میں جمع ہوتے ہیں اور بنک کے ذریعے ہی ریٹائرڈ آدمی تک پہنچتے ہیں۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ یہی آدمی اپنے ذاتی گھر کی تعمیر شروع کرتا ہے۔ گھر مکمل ہونے پر بنک خالی ہو جاتا ہے لیکن اُسے کوئی افسوس نہیں ہوتا کیونکہ گھر بن جاتا ہے اور وہی اُسے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ وہ دوبارہ مختلف ذرائع سے رقم جمع کر سکتا ہے اسی طرح موٹروے بنانے سے بنک عارضی طور پر خالی تو ہو گئے لیکن گھر بن گیا۔ میں موٹروے کو پاکستانیوں کے لیے گھر کے برابر سمجھتا ہوں اور یہ ایک دن پاکستان کی معیشت کو ترقی دے گی اور اہل پاکستان کے تحفظ کی علامت بن جائے گا۔ خالی ہونے والے بنک دوبارہ بھر گئے ہیں۔ اُنہوں نے پھر ایک لمحہ

سوچتے ہوئے کہا آپ جانتے ہیں کہ پاکستان ایئر فورس کے جنگی طیارے بھی موٹروے پر اُتارنے کا مظاہرہ کیا جا چکا ہے اور بوقت ضرورت یہی موٹروے جنگی طیاروں کے لیے رن وے کا کام دے سکتا ہے"۔ نواز شریف ابھی تک ایک سحر کی سی کیفیت میں مبتلا تھے بات کو ختم کرنے کے بجائے وہ کہنے لگے میں نے موٹروے پر انٹرچینج بنا کر چھوٹے بڑوں شہروں کا ملا دیا ہے مسافت کم ہوگئی ہے دیہی علاقوں میں بسنے والے عوام کی رسائی بڑے شہروں تک ہوگئی ہے تعلیم، کاروبار اور صحت کی سہولتوں کے حصول کے لیے فاصلہ اور وقت کم ہوگیا ہے۔ میرا تو یہ منصوبہ تھا کہ موٹروے کے ساتھ ہر سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک صنعتی شہر بساؤں گا اور اُس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے رہائشی قصبے آباد کروں گا تا کہ پاکستان کے بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ کم ہوسکے، روزگار فراہم ہوسکے، امن و امان کی صورتِ حال بہتر ہو۔ منصوبے تو بہت تھے مگر........ وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر کسی گہری سوچ میں گم ہوگئے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ کن سوچوں میں ہیں لیکن میں نے کوئی مداخلت نہ کی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان یادوں میں کھو کر پرسکون محسوس کرتا ہے اور یہ احساس انسان کو خوشی سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ سوچ کر میں بھی خاموش رہا اور کمرے میں موجود مختلف اشیاء کا جائزہ لیتا رہا اچانک وہ خود کہنے لگے "میں نے موٹروے کے ساتھ ساتھ اس سے منسلک تمام لوازمات کا بھی خیال رکھا اور انہیں عملی شکل دی۔ مثلاً موٹروے پولیس کو متعارف کروایا جو پاکستان بھر کی پولیس سے مختلف اور منفرد ہے۔ یہ اپنے رویے اور افعال و کردار میں بھی بہترین ہے۔ با اخلاق، تعلیم یافتہ اور ڈسپلن کی پابند فورس ہے جس کا انداز گفتگو قابل داد ہے۔ رشوت کا نام و نشان تک نہیں۔ قانون شکنی پر کسی کو معافی نہیں ملتی۔ مجھے بھی بطور وزیر اعظم موٹروے پولیس نے تیز

رفتاری پر جرمانہ کیا تھا جو کہ میں نے ادا کیا۔ موٹروے پولیس اس شاہراہ کے تحفظ کی بھی ضامن ہے اس لیے اس پر جرائم کی شرح صفر فیصد ہے۔ موٹروے کے جزیرے میں جو بھی تجربات کیے گئے ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ پورے ملک کو اسی سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے میں اسی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پاکستان ہر میدان میں ترقی یافتہ اقوام کے برابر کھڑا ہو سکتا ہے۔ کیا ہماری طرح کے کسی اور ملک میں اس طرح کا کوئی کارنامہ سرانجام دیا گیا ہے؟

This page is empty

لاہور کا علامہ اقبال ایئرپورٹ

جن لوگوں نے کراچی کا قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ دیکھا ہے یا یہاں سے سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ ہوائی اڈہ دنیا کے کسی بھی جدید ترین ایئرپورٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ اس کی وسعت اور تعمیر دلکش ہے۔ جدید ترین عالمی معیار ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ، نیویارک کے جے۔ ایف۔ کے ایئرپورٹ یا ریاض کے بین الاقوامی ایئر پورٹ سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس پر دنیا بھر کی تمام سہولتیں دستیاب ہیں یہ شاندار ہوائی اڈہ نواز شریف اپنے پہلے دورے وزارت عظمٰی میں تعمیر کروایا تھا اور اسے بنا کر انہوں نے ثابت کیا تھا کہ وہ میرٹ کے قائل ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے پاکستان کے سب سے بڑے اور مصروف شہر میں ہوائی اڈہ بنایا۔ کیونکہ دنیا بھر کی تمام فضائی کمپنیاں کراچی ہی میں دفاتر رکھتی ہیں اور وہاں پر اُن کے جہاز اُترتے ہیں۔

ایک دن میں میاں نواز شریف سے ملنے گیا تو وہ چند دوستوں سے محو گفتگو تھے۔ وہ لاہور سے آئے تھے اور ہوائی اڈے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے شاید انہیں کچھ مشکلات پیش آئی تھیں جنہیں سن کر نواز شریف صاحب بولے "میں ہمیشہ سے ہی پاکستان کے ایئرپورٹس کے بارے میں متفکر رہا اور بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو وطن واپسی پر درپیش مشکلات پر آزردہ رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ وہ پاکستانی جن کی محنت سے ہمارے زرِ مبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے جو ملک کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں اور ہمارے ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جب یہ محبّ وطن پاکستانی بیرونی ممالک سے واپس وطن آتے ہیں تو ان سے نامناسب

رویہ اختیار کیا جاتا ہے، کسٹم اور امیگریشن کا سلوک اچھا نہیں ہوتا، اُن سے مجرموں سا سلوک کیا جاتا ہے اُن کی عزت نفس مجروح کی جاتی ہے، اُن سے رشوت لی جاتی ہے، میں جب پہلی بار وزیراعظم بنا تو میں نے تمام ائیر پورٹس پر گرین چینلز کو متعارف کروایا تاکہ باہر سے آنے والے پاکستانیوں کو تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے میں نے تو ائیر پورٹ پر کسٹم کا محکمہ مکمل طور پر ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن کئی وجوہ کی بنا پر اس پر عمل درآمد نہ کیا جا سکا۔ میں نے واضح ہدایات جاری کیں تھیں۔ کہ امیگریشن، کسٹم اور دیگر محکمے ائیر پورٹ پر لوگوں کو تنگ کرنے سے باز رہیں کئی افراد کو سخت سزا بھی دی گئی جس سے لوگوں کو خاصا آرام ہو گیا تھا لیکن اب پھر وہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جو افسوس ناک ہے۔

میاں نواز شریف ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ عربی قہوہ اور بادام والی کھجوروں سے مہمانوں کی تواضع کی جانے لگی چند لمحوں کے لیے ہم سب اس سے لطف اندوز ہوتے رہے قہوہ حسبِ معمول خوش رنگ اور خوش ذائقہ تھا۔ بادام والی خصوصی کھجور بے حد لذیذ ہوتی ہے جو سعودی عرب کے شاہی محلات کے لیے خصوصی طور پر تیار کی جاتی ہے۔ میاں صاحب خود کم کھاتے ہیں مگر مہمانوں کو اصرار کر کے خوب کھلاتے ہیں۔ آپ نے دوبارہ گفتگو شروع کی اور لاہور جانے کی شدید خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اکثر و بیشتر لاہور جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ پاکستان اور پھر لاہور سے محبت اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ نواز شریف محل کے اندر برپا مختلف مجالس میں وطن اور لاہور کو یاد کر کے شاید اپنے غم کی شدت کم کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے پہلی وزارتِ عظمیٰ میں کراچی ائیر پورٹ تعمیر کروایا اب میرا خیال تھا کہ لاہور میں بھی اسی معیار کا ائیر پورٹ بناؤں گا کیونکہ پرانا ائیر پورٹ نئے تقاضوں سے ہم

آہنگ نہ تھا۔ دوسری بار وزیراعظم بنتے ہی نئے ایئرپورٹ کے لیے وسیع رقبہ حاصل کیا۔ خوبصورت ڈیزائن منظور کرلیا گیا اور کام کا آغاز ہوگیا مگر بدقسمتی سے جب فوجی حکومت آئی تو میری مخالفت کے ساتھ ساتھ قومی ترقی کے منصوبوں کو بھی پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ لاہور ائیرپورٹ کا ڈیزائن تبدیل ہوگیا۔ اس کا حجم بھی نصف کر دیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب یہ چھوٹا محسوس ہو رہا ہے۔ تنگی کا احساس ہو رہا ہے۔ میرا یہ منصوبہ تھا کہ اس کو اس طرح تعمیر کیا جائے کہ یہ پچاس برس تک کافی ہو۔ لیکن فوجی حکمرانوں نے اپنی کوتاہ اندیشی اور کم نظری سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔

حلیہ بگاڑنے کی بات ہوئی تو میں نے ہنستے ہوئے کہا ''جناب لاہور ائیرپورٹ کا ڈیزائن عجیب سا ہے اور یہ قلعہ سا لگتا ہے'' میری بات سن کر انہوں نے سنجیدگی اور متانت سے کہا ''میرے پاس بہت سے ڈیزائن آئے تھے مگر میں نے اس ہی کو منظور کیا تھا کیونکہ لاہور ائیرپورٹ کو ہیتھرو یا جے۔ایف کینیڈی کی طرح شیشوں کا بنا ہوا نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی اُس طرح کا طرزِ تعمیر ہونا چاہئے۔ ہمارے ائیرپورٹس کو ہمارے مزاج، موسم اور طرزِ تعمیر کا نمونہ ہونا چاہئے اُن میں ہماری تاریخ کی جھلک نظر آنی چاہئے۔ ہمارے فنِ تعمیر کا رنگ نمایاں ہونا چاہئے اسی لیے میں نے یہ ڈیزائن منظور کیا تھا''۔

This page is empty

ییلو کیب سکیم کا خواب

لاہور ائیر پورٹ کے بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میاں صاحب اس حوالے سے دل گرفتہ نظر آتے تھے کہ اُن کی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق یہ ائیر پورٹ تعمیر نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ ایک حسین اضافہ ہے لیکن اگر یہ اپنی اصلی شکل وصورت میں بنتا تو دیر تک اُس کے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے ییلو کیب سکیم متعارف کروائی تھی تو آپ کے سامنے کیا مقاصد تھے وہ بولے "میں نے ییلو کیب ہی نہیں بلکہ ییلو ٹریکٹر اور ییلو بوٹ سکیم متعارف کروائی تھی تاکہ زمین اور سمندر میں لوگوں کو روزگار فراہم ہو سکے غریب کسان کسی کا محتاج نہ رہے جب میں ایام جوانی میں اپنے والد صاحب اور بھائیوں کے ہمراہ کاروبار کرتا تھا اور اکثر و بیشتر اپنے غیر ملکی کاروباری مہمانوں کو لینے ائیر پورٹ جاتا تھا تو وہاں کوئی ڈھنگ کی ٹیکسی یا ٹرانسپورٹ میسر نہ ہوتی تھی۔ شور کرتے اور دھواں دیتے ہوئے رکشہ نظر آتے تھے۔ پرانے ماڈل کی غیر آرام دہ اور بدشکل ٹیکسیاں ہارن بجاتے ہوئے مہمانوں کو پریشان کرتی تھیں میں یہ باتیں دیکھتا اور سوچتا تھا کہ اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی دوروں کے دوران میں دیکھتا تھا کہ ائیر پورٹ کے باہر صاف ستھری ٹیکسیاں قطار میں مہمانوں کا انتظار کر رہی ہوتی تھیں۔ یونیفارم پہنے باادب ڈرائیور ساتھ کھڑے ہوتے تھے اور مہمانوں سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا اور انہیں مکمل راہنمائی فراہم کی جاتی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا کے چھوٹے چھوٹے ممالک میں بھی یہ نظام نافذ تھا۔ میری خواہش یہی تھی کہ کاش میرے ملک میں بھی ایسا ہی ہو۔ میں اللہ کے فضل سے وزیر اعظم بنا تو اپنے خواب اور خواہشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ

فیصلہ کیا۔ ملک بھر میں ییلو کیب ٹیکسی متعارف کروائی جس سے ملک بھر کی ٹرانسپورٹ میں ترقی ہوئی اور تیزی بھی آئی لاکھوں افراد کو ایک باعزت روزگار میسر ہوا۔ ٹرانسپورٹ کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ نیا کلچر شروع ہوا۔ ائیر پورٹ سے باہر نکل کر نئے ماڈل کی صاف ستھری گاڑیاں قطار میں موجود ہوتی ہیں اور کوئی کوفت بھی نہیں ہوتی اب یہ گاڑیاں پاکستان کے ہر شہر میں موجود ہیں۔ ذارئع آمدورفت آسان ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے تمام شہروں، قصبوں اور دیہات میں ائیر کنڈیشنڈ گاڑیاں مل جاتی ہیں جو کہ آرام دہ بھی ہیں اور تیز رفتار بھی۔ ہم نے پاکستان میں جدید ٹرانسپورٹ سسٹم کی بنیاد رکھی۔ اقتدار تو آنی جانی چیز ہے لیکن میرا ایجنڈا یہ ہے کہ خدمات کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے تا کہ عوام کی مشکلات میں کمی ہو۔

انشاء اللہ مستقبل میں بھی اگر ہمیں موقع ملا تو ٹرانسپورٹ کے نظام میں انقلابی تبدیلی لائی جائے گی اس کے لیے میرے ذہن میں چند منصوبے ہیں۔ لاہور، کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں سرکلر ریلوے کا آغاز کیا جائے گا۔ کاروبار سے متعلق شہروں کے درمیان چھوٹے ہوائی جہازوں کی شٹل سروس شروع کی جائے گی۔ مختلف شہروں میں پرائیویٹ افراد اور کمپنیوں کے تعاون سے ائیر پورٹ تعمیر کیے جائیں گے۔ ریڈیو کنٹرول ٹیکسیوں کا نیٹ ورک قائم کیا جائے گا۔ سی این جی پر چلنے والی بسوں اور ٹرکوں کے ذریعے کرایوں میں خاطر خواہ کمی کی جائے گی۔

ٹیلیفون کی سہولت

میاں محمد نواز شریف کو پاکستان سے جلاوطن ہو کر جدہ آئے کئی برس گزر گئے میں ایک روز اُن کے سامنے بیٹھا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی دیکھ کر بولے یہ کون سا سیٹ ہے میرے جواب پر اُنہوں نے موبائل فون کے بارے میں مفصل گفتگو کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موبائل فون کی مختلف اقسام اور ماڈلز کا وسیع علم رکھتے ہیں۔ اسی گفتگو کے دوران میاں صاحب نے بتایا کہ جب وہ پہلی بار وزیراعظم بنے تو پورے پاکستان میں صرف دو لاکھ ٹیلیفون کنیکشن موجود تھے جبکہ ملک کی آبادی تقریباً چودہ کروڑ تھی یہ صورتِ حال تکلیف دہ اور افسوس ناک تھی۔ ٹیلیفون کو بھی رشوت اور سفارش کا ذریعہ بنا دیا گیا تھا۔ ترقی کے لیے کمیونیکیشن سب سے اہم ہے میں نے اسی لیے مختلف متعلقہ محکموں کے سربراہان سے ملاقاتیں کیں اور کہا کہ ملک کے ہر شہری کو یہ سہولت فراہم ہونی چاہیے اور کنیکشن مانگنے والے کسی بھی صارف کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس ہدایت پر کام شروع ہوا مثبت نتائج برآمد ہوئے اور صرف دو سال کی محدود مدت میں ٹیلیفونز کی تعداد دو لاکھ سے بڑھ کر بائیس لاکھ ہو گئی اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ بین الاقوامی کمپنیاں بھی سرمایہ کاری کے لیے آگے آئیں اور آج اُسی کی بدولت اس میدان میں پاکستان دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہے اور ہم اس میدان میں اپنے ہمسایہ ملک بھارت سے کہیں آگے ہیں۔ موبائل فون کے آغاز میں بھی ہم اپنے ہمسایہ ممالک پر برتری حاصل ہے۔ بھارت میں موبائل فونز کا آغاز ہمارے بعد ہوا بلکہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی یہ سلسلہ 1992ء کے بعد شروع ہوا۔

This page is empty

عدل وانصاف کی فراہمی

نواز شریف صاحب سے قیمتی گفتگو کو شمار کرنا اور اُن کی جزئیات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا آسان کام نہیں لیکن مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ انہوں نے کئی بار پاکستان میں عدل وانصاف کی تشویشناک صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور اس عزم کا اعادہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کے بے بس اور مظلوم عوام کو انصاف کی فراہمی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ایک روز اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نواز شریف کہنے لگے ”جب میں اوائل جوانی میں اخبارات کے توسط سے اور لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران مظالم کی کہانیاں سنتا، انصاف کا خون ہوتے دیکھتا، براہِ راست خون ریز واقعات کی تفصیل جانتا تو بہت پریشان ہوتا، میں نے بچپن ہی سے عدل وانصاف پر مبنی اسلامی تاریخ کے واقعات پڑھے تھے میرے دل میں ایک ولولہ سا اُٹھتا کہ کاش ہمارے ملک میں بھی انصاف ہو، کاش ناانصافی کا خاتمہ ہو سکے، میرے والد صاحب کی بھی دلی خواہش ہوتی تھی کہ جو مظلوم اُن کے پاس آئے وہ اُسے اُس کا حق دلائیں۔ انسانیت کی تذلیل واقعی مجھے بہت پریشان کرتی۔ میں جب سیاست میں آیا تو میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں یہ سب باتیں محفوظ تھیں۔ میں سوچتا تھا اگر مجھے کبھی موقع ملا تو میں کوشش کروں گا کہ قاتلوں، ظالموں، راہزنوں اور ڈاکوؤں کو سزا دے سکوں۔ پھر جب اللہ کے فضل وکرم سے مجھے وزارتِ اعلیٰ اور پھر دو بار وزارتِ عظمیٰ ملی تو میں نے بھرپور کوشش کی کہ ظالموں کا رستہ روک لوں، اُن کے راستے کی دیوار بن جاؤں۔ جرائم اور مجرموں کے خاتمہ کی تمنا لیے میں نے خصوصی عدالتیں تشکیل دیں تا کہ فوری انصاف فراہم ہو سکے مظلوموں کی

دادرسی ہوسکے اللہ کے کرم سے مجھے کامیابی نصیب ہوئی۔ میں نے اس کام کی خود نگرانی کی تھی۔ پاکستان بھر میں جہاں بھی کسی سے زیادتی ہوئی، ظلم ہوا کسی حرمت و عزت کو پامال کرنے کی انفرادی یا اجتماعی کوشش کی گئی میں ذاتی طور پر وہاں پہنچا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ روائت قائم ہوئی۔ اگر مقامی پولیس مظلوموں کی داد رسی نہ کر رہی ہوتی تو میں اُن کا احتساب کرتا اس کوشش میں بعض اطراف سے میری مخالفت بھی کی گئی۔ خصوصی عدالتوں کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن عوام کی اکثریت نے میرے فیصلوں کی تائید کی۔ میں دوبارہ وزیر اعظم بنا تو فیصلہ کیا کہ انصاف ہر گھر کی دہلیز تک لے جاؤں گا۔ اس دوران کسی مظلوم یا مقہور خاندان کے پاس خود جاتا تو چند لوگ تنقید کرتے ہوئے کہتے کہ وزیر اعظم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح دور دراز کے دیہاتوں میں لوگوں تک خود چل کر جائے۔ لیکن میں اُس وقت بھی ان مشوروں کو سنتا لیکن ان پر عمل نہ کرتا میں اُس وقت بھی اور اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ اگر حکمران کسی مظلوم کو انصاف دلانے کے لیے خود چل کر جاتا ہے تو اس سے ظالموں کے خلاف ایک واضح پیغام سارے معاشرے میں پہنچے گا۔ عدل وانصاف کے عمل میں تیزی آئے گی۔ انصاف فراہم کرنے والے افراد اور ادارے چوکنا رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سرخرو کیا، میں مطمئن ہوں۔"

وہ کہہ رہے تھے: "اگر اللہ نے چاہا تو میں مستقبل میں غیر جانب دار، ایماندار، تعلیم یافتہ اور جرأت مند افراد پر مشتمل عدلیہ تشکیل دوں گا جہاں پر صرف میرٹ کی حکمرانی ہوگی۔

نواز شریف کی کھلی کچہری

نواز شریف جب بھی اقتدار میں آئے انہوں نے ہمیشہ اپنے دروازے ضرورت مندوں، غربا اور انصاف کے متلاشی لوگوں کے لیے کھول دیے۔ ہر اتوار کو لاہور میں ماڈل ٹاؤن والی رہائش گاہ میں کھلی کچہری منعقد ہوتی جس میں پاکستان بھر سے لوگ اپنے مسائل اور مطالبات لے کر پیش ہوتے۔ نواز شریف موقع پر ہی احکامات جاری کرتے۔ اس کچہری کے روح رواں خواجہ ریاض محمود سابقہ میئر لاہور تھے اور وہ فوجی قبضے کے بعد گرفتاری ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ہی لاہور میں مقیم 114 بریگیڈ کے دفتر میں یہ فرماتے ہوئے پائے گئے: ''میں تو نواز شریف کو بہت سمجھاتا تھا مگر وہ میری بات نہ سنتے تھے اور اب ہم سب بھگت رہے ہیں'' اس کے بعد وہ اپنی وفاداریاں تبدیل کر گئے اور اُن ایک بیٹے نے حکومتی مسلم لیگ کی طرف سے لاہور میں بلدیاتی انتخابات میں شکست کھائی۔

کھلی کچہری کے علاوہ نواز شریف وزیراعظم ہاؤس میں ضرورت مندوں کی ٹیلی فون کالز خود وصول کرتے اُن سے بات کرتے اور اُن کے مسائل حل کرنے کے لیے احکامات جاری کرتے۔ سنگین جرائم یا زیادتی کی شکل میں وہ خود جائے وقوعہ پر پہنچتے اور انصاف کی فراہمی کو یقینی بناتے۔ ایک بار میں نے جدہ ہی میں ان کے بارے میں سوال کیا تو بولے: ''جب تک حکمران خود جاگ نہ رہا ہو اور اسے اپنے ملک کے حالات و واقعات کا صحیح علم نہ ہو انصاف کی فراہمی ناممکن ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدین کا دور حکمرانی کی بہترین مثال ہے اور دنیا بھر کے مسلمان حکمرانوں کے لیے مشعلِ راہ بھی ہیں۔

This page is empty

پاکستان میں ٹورازم کا فروغ

میاں محمد نواز شریف پاکستان کے ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدا ہی سے آسودہ زندگی گزاری پاکستان کے بہترین اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران اکثر وہ اکیلے یا اہل خانہ کے ہمراہ تفریح کے لیے مختلف شہروں میں جاتے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے کاروبار کا آغاز کیا تو شوق سیاحت بھی بڑھتا گیا۔ انہوں نے پاکستان کے طول و عرض میں سفر کیا، اور مشاہدے کی آنکھ سے چیزوں کا بغور جائزہ بھی لیا۔ شائد قدرت انہیں اسی طریقے سے پاکستان کی قیادت کے لیے تیار کر رہی تھی۔ ایک روز پاکستان کے لازوال قدرتی حسن اور خوبصورتی سے مالا مال علاقوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے فرمایا کہ" میں نوجوانی میں وطن عزیز کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے بہت سے علاقے اتنے دلکش اور خوبصورت ہیں کہ شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں اتنا قدرتی حسن ہو۔ مجھے سیر کی غرض سے گھومنے پھرنے کا ہمیشہ شوق رہا ہے۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ زمانۂ طالب علمی کے دوران مری جاتا تھا اور افسوس ہوتا تھا کہ اتنا خوبصورت علاقہ ہے لیکن اس کی ترقی کی طرف حکمران کوئی توجہ نہیں دیتے۔ وہی تنگ و تاریک اور پُر پیچ سڑکیں جو انگریز حکمران چھوڑ گیا تھا۔ وہی شکستہ اور خطرناک راہیں! لیکن جب میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا تو فوری طور پر ٹورازم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بہاولپور کے لال سوہانرا ریسٹ ہاؤس سے لے کر، کلر کہار کی جھیل ہو، جلو پارک ہو، چھانگا مانگا کا جنگل ہو شالامار باغ، لاہور کا شاہی قلعہ اور مختلف پارک اور باغات سب کی تزئین اور آرائش اور مرمت کا کام ہنگامی بنیادوں پر مکمل کرایا۔

مری کی ترقی کے لیے خصوصی توجہ دی راولپنڈی سے مری جانے والی سڑک کو دورویہ، وسیع اور خوبصورت بنایا خطرناک موڑ کم کیے خصوصی آئینے نصب کرائے سڑک کے کنارے حفاظتی بلاکس لگوائے، پتریاٹہ کے جدید تفریحی مقام کی تعمیر شروع کرائی۔ نیومری کا منصوبہ بنایا''۔ مری کے ذکر سے نواز شریف خاصے جذباتی ہو گئے۔ کہنے لگے ''میرے آنے کے بعد حکومت نے مری پر کوئی توجہ نہیں دی اور میرے دور میں بنائی گئی سڑک اب تک کام آ رہی ہے اور لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ حکمران آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن اُن کی خدمات کے نشان زندہ رہ جاتے ہیں۔ اُن کے منظر سے ہٹنے کے بعد بھی لوگ اُن سے فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ ساری برکتیں جمہوریت کی ہیں۔ وگرنہ ایک مخصوص طبقہ ہی قومی خزانے سے فائدہ اُٹھاتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے دور میں پاکستان کے چاروں صوبوں میں سرکاری ریسٹ ہاؤسز کی تزئین کی اور آرائش کروائی اُن کو رہنے کے قابل بنایا تاکہ ملکی اور غیر ملکی سیاح وہاں قیام کر سکیں۔ مختلف شہروں میں پنجاب ہاؤس تعمیر کرائے تاکہ سرکاری افسران اور ممبران اسمبلی مہنگے ہوٹلوں کی بجائے وہاں قیام کر سکیں۔ تعمیر و ترقی کا شوق مجھے ہمیشہ سے تھا''۔ وہ کہتے گئے: ''جوانی میں شکار کھیلنے کا مجھے بے حد شوق تھا۔ لیکن میں شکار ہمیشہ قانون و قاعدے کے مطابق کھیلتا تھا۔ حکومت نے ملک کے اندر جہاں جہاں اور جس موسم میں جتنا شکار کرنے کی اجازت دے رکھی تھی ہمیشہ اُس کی پابندی کی۔ ایک بار اپنے چند دوستوں کے ہمراہ چولستان میں شکار کھیلتے ہوئے میرے ایک دوست نے اجازت کے برعکس ایک ہرن پر فائر کیا تو میں نے اپنے ہاتھ سے اُس کی بندوق آسمان کی طرف اُٹھا دی جس سے وہ ہرن بچ گیا وہ دوست چند لمحوں کے لیے مجھ سے ناراض ہوا مگر بعد ازاں میری بات سے اتفاق کیا کہ غیر قانونی

شکار جرم ہے۔ چولستان کا علاقہ بھی اس غرض سے بہت دیکھا۔ اپنے دورِ اقتدار میں اس علاقے کی ترقی کے لیے بہت سے منصوبے بنائے جو انشاءاللہ اب پورے کروں گا۔ چولستان میں جدید طریقوں سے پانی فراہم کیا جائے گا اور وہاں کی ذرخیز زمین سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے گا۔ جس طرح سعودی عرب کے صحراؤں میں درخت، گھاس، جھاڑیاں، پودے، گندم، چاول، سبزیاں اور پھل اُگائے جا سکتے ہیں بالکل اُسی طرح چولستان کو بھی آباد کیا جائے گا، ملک میں موجود پانی کے ایک ایک قطرے کی حفاظت کی جائے گی اور اُس کی فراہمی کے لیے مکمل طور پر کامیاب منصوبہ بندی کی جائے گی۔ وہاں پر مختلف لوگوں کو غیر قانونی طور پر اَلاٹ کی گئی زمین کی تحقیقات کراؤں گا۔'' انہوں نے مزید کہا: ''غیر ملکی سیاحوں کو ترغیب دینے کے لیے خصوصی پروگرام تشکیل دینے کی ضرورت ہے کہ غیر ملکی سیاحوں کی آمد سے پاکستان کا امیج بھی بہتر ہو گا، زرِمبادلہ حاصل ہو گا اور متعلقہ علاقوں میں بھی ترقی ہو گی لیکن ٹورازم کی ترقی اُس وقت ہی ممکن ہو گی جب ملک میں امن وامان کی صورت حال تسلی بخش ہو گی۔''

This page is empty

پاکستان کے ایٹمی دھماکے اور پاک بھارت تعلقات

میاں نواز شریف کے دور میں کئی قابلِ فخر کارنامے سرانجام دیے گئے ہیں لیکن ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ ویسے تو پاکستان نے بہت عرصہ قبل ایٹم بم تیار کرلیا تھا۔ مغربی ذرائع ابلاغ اور پاکستان دشمن عناصر اس بارے میں وقتاً فوقتاً کہانیاں شائع کرتے رہتے تھے کبھی سچ اور کبھی جھوٹ چھپتا رہتا تھا۔ شدید بیرونی دباؤ کے باوجود ایٹمی دھماکے کر کے انہوں نے پاکستان کو دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت بنا دیا۔

پاکستان کو غربت اور تنگ دستی کے باوجود ایٹمی ہتھیار بنانا پڑے۔ ہمارے ازلی دشمن بھارت نے 1971ء میں پاکستان کو دولخت کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ 1974ء میں بھارت کے ایٹمی تجربہ سے پاکستان مزید خطرات سے دوچار ہوگیا۔ پاکستان کا دفاع مشکل ہوگیا۔ ایسے میں مجبوراً پاکستان نے بھی ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس کام کا آغاز کیا اور اس کے بعد تمام حکومتوں اور سربراہان مملکت نے اسے جاری رکھا۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام جارحیت پر مبنی نہیں تھا بلکہ ملکی دفاع اور سلامتی کے لیے ایک فیصلہ کن اقدام تھا۔ مئی 1998ء میں بھارت نے پاکستان کے صوبہ سندھ سے متصل اپنے صحرائی علاقے میں ایٹمی دھماکے کیے تو پاکستان کو بھی مجبوراً جواب میں دھماکے کرنے پڑے۔ چھپا ہوا راز افشا کرنا پڑا۔ میاں نواز شریف کے حکم پر ضلع چاغی بلوچستان کے خشک پہاڑوں میں ایٹمی دھماکے کی تیاریاں مکمل کی گئیں اور اللہ اکبر کی ایک ہی صدا کے ساتھ یکے بعد دیگرے 6۔ایٹمی دھماکے کر دیے گئے۔

چاغی کا پہاڑ سیاہ سے سفید ہو گیا۔ ان دھماکوں کی بازگشت ساری دنیا میں سنائی دی دشمن دہل گئے۔

ایک روز حسبِ معمول سرور پیلس میں مجلس برپا تھی۔ اس روز ایٹمی دھماکے کی سالگرہ بھی تھی میں نے موقع مناسب جانا اور نواز شریف صاحب سے پوچھا ''کیا آپ نے ایٹمی دھماکہ کرنے سے قبل استخارہ کیا تھا؟''

کہنے لگے: ''نہیں ڈاکٹر صاحب میں ایٹمی دھماکہ کرنے سے قبل کوئی استخارہ نہیں کیا تھا۔ جب ہم نے تیاری مکمل کر لی اور فیصلہ کر لیا کہ دھماکہ ناگزیر ہو چکا ہے تو میں نے سینکڑوں افراد سے مشورہ کیا بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کام کرنے سے بہت سے ممالک اور طاقتور شخصیات پاکستان کی دشمن بن جائیں گی۔ بعض نے کہا کہ دھماکہ کر دیجئے۔ ایک روز میں نے اس سلسلے میں والد صاحب سے پوچھا اور اُن کا مشورہ حاصل کرنا چاہا تو انہوں نے میری سب باتیں سنیں۔ میں نے انہیں اس کے حق اور مخالفت میں تمام دلائل بھی گوش گزار کیے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا ''اب دیر کس بات کی ہے، بسم اللہ کرو''۔

دھماکے کرنے سے قبل امریکی صدر بل کلنٹن کے متعدد فون آئے انہوں نے دھماکہ نہ کرنے کی صورت میں متعدد ترغیبات بھی دیں میری ذات کے لیے اور پاکستان کے لیے کئی آفرز کیں۔ صدر بل کلنٹن نے کہا کہ اگر ہم یہ دھماکے نہ کریں تو پاکستان کو دفاعی اور اقتصادی میدان میں ایسی امداد دی جائے گی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ دنیا میں بے نظیر ہو گی اور اس کے علاوہ یہ امریکہ کی تاریخ میں بھی بے مثال ایڈ ہو گی۔ پاکستان کو دفاعی چھتری بھی فراہم کی جائے گی۔ لیکن بھارت نے

ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی اور ملک تاریخ کے ایسے نازک موڑ پر کھڑا تھا کہ یہ فیصلہ ناگزیر تھا میں نے صدر کلنٹن سے صاف الفاظ میں کہا تھا جناب صدر اگر ہم نے اس وقت ایٹمی دھماکہ نہ کیا تو میری قوم میرا دھماکہ کر دے گی۔ انہوں نے مزید کہ اگر آپ صدر بل کلنٹن کی سوانح حیات (My Life) کا مطالعہ کریں تو میری ان سب باتوں کی تصدیق ہو جائے گی"۔ نواز شریف نے دمکتے، چمکتے چہرے سے، جس میں خوشی بھی تھی اور فخر بھی، کہا: "ہم نے ہر قسم کے لالچ، خوف اور دھمکی سے بالاتر ہو کر ایٹمی دھماکے کیے جو تعداد اور طاقت میں بھارت سے کہیں زیادہ تھے۔ ان دھماکوں نے پاکستان کا سر فخر سے بلند کر دیا اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے سے، پلک جھپکتے میں پاکستان عالم اسلام کا قائد بن گیا۔ عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بننا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عالمی قوتوں کو ہماری یہ جرأت اور جسارت ناگوار گزر رہی تھی۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے ہمارے دشمن کے آگے بڑھتے ہوئے ناپاک قدم ہمیشہ کے لیے روک دیے تھے۔ پاکستان کے گرد ہمیشہ کے لیے تحفظ اور حفاظت کا ایک ناقابل شکست حصار بنا دیا تھا۔ یہی صلاحیت تھی جس نے کارگل کی جنگ کے دوران بھارت کو یلغار سے روکے رکھا تھا۔ بعدازاں جب 2000ء میں بھارت نے پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ لاکھوں کی تعداد میں فوج متعین کی تھی تو اس دوران بھارت صرف ایٹم بم کی طاقت سے خائف ہو کر ہی پاکستان پر حملے سے باز رہا تھا"۔ نواز شریف نے گفتگو کے دوران اچانک کہا "ایٹمی دھماکہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لاتعداد مراحل اور آزمائشیں آئیں۔ خدشات وخطرات کا قبل از وقت ادراک اور پھر اُن سے نبرد آزما ہونا وقت کی ضرورت تھی لیکن ہم اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو واشنگٹن سے آنے والی ایک فون سے خوف زدہ ہو کر قدموں میں گر

جاتے ہیں اور سارے مطالبات تسلیم کرتے جاتے ہیں''۔

نواز شریف نے یہ قابلِ فخر کہانی سنائی تو کارگل کا ذکر بھی آ گیا اور پاک بھارت جینگ پر بھی نکتہ آرائی ہوئی۔ نواز شریف پیچیدہ اور مشکل امور کا احوال بھی سادہ زبان میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ جولائی 1998ء میں سارک کانفرنس کے موقع پر میری بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی سے کولمبو، سری لنکا میں ملاقات ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ ''1999ء میں پاکستان کے دورے پر آئے اُن کا پاکستان آنا نظریہ پاکستان کی فتح اور ہماری جمہوری حکومت کی شاندار کامیابی تھی۔ واجپائی صاحب واہگہ کے راستے لاہور آئے اور پھر مینارِ پاکستان بھی گئے جہاں انہوں نے پاکستان کو ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے طور پر تسلیم کیا۔اُن کا دورہ لاہور اس لیے بھی زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ وہ ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو قیام پاکستان کی مخالف تھی اور اس کے راہنما ہر موقع پر پاکستان کو تسلیم نہ کرنے کی بات کرتے تھے۔ وہ بھارتی مسلمانوں کو بھی ایک خاص نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کی پارٹی متشدد اور انتہا پسند سمجھی جاتی تھی لیکن، میں اور واجپائی صاحب نے فیصلہ کرلیا تھا کہ دسمبر 1999ء تک کشمیر کا مسئلہ حل کر لینا ہے۔ میں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ مسئلہ کشمیر کا حل کشمیریوں اور پاکستانیوں کی امنگوں اور خواہشوں کے مطابق طے ہونا تھا۔ دوسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ میں موجود چند عاقبت اندیش افراد نے بعض لوگوں کو اُکسا کر زبردست احتجاجی مظاہرے منعقد کروائے یہ دراصل ہماری بات چیت کو ناکام کرنے کی ایک کوشش تھی اور آدابِ میزبانی کے بھی خلاف تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ یہ مظاہرے کرنے والے یہ بات فراموش کر بیٹھے تھے کہ وہ ایک عظیم مقصد کو

نقصان پہنچارہے ہیں۔ ان ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ معاملہ موخر ہو گیا اور جن لوگوں نے طاقت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا وہ آج تک مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لیے بھارت سے بھیک مانگ رہے ہیں لیکن مل نہیں رہی۔ ہم نے تو بھارت کو وہ مراعات پیش نہیں کی تھیں جو آج کے حکمران کر رہے ہیں۔ عزت نفس مجروح ہو رہی ہے، بزدلی کا اظہار ہو رہا ہے اس کے باوجود یہ مسئلہ کسی طور بھی حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ واجپائی صاحب کے دورہ کے دوران مظاہرے کرنے والے بعدازاں ان کے دورہ پاکستان پر بالکل خاموش رہے۔ ان مظاہروں اور واجپائی صاحب کے دورہ کے دوران ہی کارگل میں جنگ چھیڑنے سے مجھے ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا''۔

This page is empty

کارگل کی جنگ ۔ ذمہ دار کون تھا؟

کارگل کی جنگ ایک ایسا متنازع موضوع ہے جس کے بنیادی ماخذ اسرار کی تہوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ کئی برس گزرنے کے باوجود پاکستان اور بھارت میں آج تک اس پر بحث وتمحیص ہو رہی ہے۔ دونوں ممالک میں اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یورپی اور امریکی مصنفین نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنی سوانح عمری میں اس پر اپنا نقطہ نظر اور مشاہدات قلمبند کیے ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح راولپنڈی کے اوجڑی کیمپ میں لگنے والی پراسرار آگ کی انکوائری کر کے ذمہ داروں کو سزا دینے کے مطالبے پر وزیراعظم محمد خان جونیجو کو وزارتِ عظمیٰ سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح جب وزیراعظم نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف سے یہ مطالبہ کیا کہ کارگل جنگ کی انکوائری کروائی جائے اور وزیراعظم کی اجازت کے بغیر جنگ شروع کرنے کے ذمہ دار جرنیلوں کو سزا دی جائے تو انہیں اپنی وزارت عظمیٰ سے محروم ہونا پڑا۔ پاکستان کی تاریخ اس طرح کے سانحات سے عبارت ہے۔ ممکن ہے نواز شریف صاحب کی اقتدار سے رخصتی کی کئی وجوہات اور بھی ہوں لیکن اس میں بڑا حصہ کارگل جنگ کا ہے۔ نواز شریف نے اس سلسلہ میں مجھے بتایا: ”کارگل جنگ چند جرنیلوں کی حماقت تھی۔ انہوں نے اتنا بڑا محاذ میری مرضی اور اجازت کے بغیر کھول دیا تھا۔ حد ہے کہ اتنا بڑا اور نازک قدم اُٹھانے سے قبل جنرل پرویز مشرف نے مجھے پوچھا تک نہیں۔ یہ بات میرے علم میں قطعی نہیں تھی کہ کارگل کے محاذ پر ہر روز کئی جوان

شہید ہو رہے تھے اور وہ ملک کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ کارگل کی وادیاں ہمارے جوانوں کے لہو سے رنگی جا رہی تھیں اور ہم اس سے آگاہ نہ تھے۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہار واجپائی نے اس جنگ کے حوالے سے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ نواز شریف نے میری پشت میں خنجر مارا ہے لیکن دراصل فوجی جرنیلوں نے میری پیٹھ میں خنجر مارا تھا اور جب تیزی سے قدم اکھڑنے لگے اور توقعات پوری ہونے کے امکانات ختم ہو گئے اور اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ انڈیا پاکستان پر ایک مکمل حملہ کرنے والا ہے تو یہی ہمارے سورما جرنیل بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور کہا پاکستان کو اور ہمیں بچایئے کیونکہ ہم ایک مکمل جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں۔ اُس وقت کے چیف اور ایئر سٹاف نے بھی کارگل آپریشن کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا میں وزیراعظم تھا اور ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اس لیے اپنا ملک بچانے کے لیے اور اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے میں نے فوری طور پر اہم دوست ممالک سے رابطہ کیا۔ میں امریکہ بھی گیا اور امریکی صدر بل کلنٹن، جو میرے ذاتی دوست بھی تھے، سے ملا اور بالآخر یہ جنگ ٹل گئی۔ پاکستان ایک بہت بڑے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔ میں امریکہ سے واپس آیا تو اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر جنرل مشرف اور دیگر جرنیل موجود تھے انہوں نے مجھے سیلوٹ مارنے کے بعد بیک زبان کہا تھا۔ مسٹر پرائم منسٹر، ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ایک بڑی جنگ کو ٹال دیا اور پاکستان ایک بڑی مصیبت سے بچ گیا"۔ "نواز شریف نے واضح اور صاف الفاظ میں کہا" "میں نے اس سانحے کے فوراً بعد جنرل پرویز مشرف کو حکم دیا کہ کارگل جنگ کے ذمہ دار جرنیلوں کی انکوائری کی جائے اور انہیں سزا دی جائے ان لوگوں میں جنرل عزیز خان بھی شامل تھے لیکن

جنرل پرویز مشرف مجھ سے تو انکوائری کرنے کی حامی بھرتے رہے مگر دانستہ طور پر اس معاملے کو لٹکاتے رہے۔ انہی دنوں میں میں نے سیاچین کا دورہ کیا تو ایک بار پھر میں نے جنرل پرویز مشرف سے اس انکوائری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا 'سر' اس معاملے میں تیزی سے پیش رفت جاری ہے اور آپ کو جلد ہی رپورٹ پیش کی جائے گی لیکن بعدازاں مجھے انٹیلی جینس کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے بتایا کہ سیاچین سے واپس آتے ہی جنرل مشرف نے اپنے ساتھی اور سازشی جرنیلوں، جو کہ کارگل جنگ کے انہی کی طرح ذمہ دار تھے، سے کہا تھا کہ نواز شریف آپ لوگوں کے بارے میں سخت فیصلہ کرنے والے تھے لیکن میں نے اُن سے درخواست کر کے آپ لوگوں کو بچالیا ہے۔ میں نے یہ بات سنی تو مجھے دکھ ہوا اور میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ آئندہ جنرل مشرف پر کوئی بھی اعتبار نہیں کرنا ہے۔ اسی جگہ سے ہمارے راستے جدا ہوتے گئے۔ یہ کارگل جنگ سے بھی بڑا سانحہ تھا۔

This page is empty

مختلف شخصیات کے بارے میں تاثرات

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے نواز شریف صاحب اُن سب لوگوں کے بارے میں پوری طرح باخبر رہتے تھے جنہوں نے اقتدار کی خاطر ایک غیر جمہوری حکومت اور قیادت قبول کر لی تھی اور نواز شریف سے پرانی دوستی توڑ ڈالی، برسوں کا یارانہ پل بھر میں ختم کر ڈالا تھا۔ جب کبھی شام کی محفل میں ان بے وفا اور وعدہ شکن افراد کا ذکر ہوتا تو نواز شریف اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتے اور کہتے: ''نادان لوگ ہیں''۔

چوہدری شجاعت حسین صاحب کے بارے میں کہتے: ''کہ انہوں نے شروع میں تو میری وفاداری کا دم بھرا لیکن بعد میں وہ مسلم لیگ (ق) کے صدر بن گئے۔ پاکستان میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اس حرکت کو پسند کیا ہوگا۔ جب میں انہیں اخبارات میں یا ٹی۔وی چینلز پر گفتگو کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ وہ کیا بیان فرمارہے ہیں اور کس طرح فرمارہے ہیں۔

اکرم ذکی، جو کئی ممالک میں سفارتی منصب سے عہدہ برآ ہونے کے بعد پاکستان کی وزارت خارجہ میں سیکرٹری جنرل بنے۔ بعدازاں نواز شریف کی مہربانی، محبت اور کرم فرمائی سے سینیٹر بنے اور مسلم لیگ کے مرکزی رہنماؤں میں شامل رہے۔ لاہور سے مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر جناب ہمایوں اختر کے خلاف قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ قابل اعتماد ساتھی تھے نواز شریف سے باقاعدہ رابطہ رکھتے تھے۔ اُن کی بے وفائی پر وہ بہت غصہ میں رہے اور اُن کے پارٹی بدلنے کے اقدام کے بارے میں کہا: ''یہ عجیب لوگ ہیں جو عمر کے آخری حصہ میں اپنی عزت کھو دیتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے بے وفائی کرتے ہوئے اپنے وقار، منصب اور عمر کا بھی خیال نہیں رکھا۔''

جنرل ریٹائرڈ مجید ملک بھی اُن لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے نواز شریف کو چھوڑ دیا اور کوئی ندامت محسوس نہ کی ایک شام نواز شریف نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''کہ مجید ملک صاحب کو میں نے ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا ہے اُن کی بہت عزت اور احترام کیا ہے وہ میرے والد کی عمر کے قریب ہیں۔ 1974ء میں جرنیل بنے تھے پھر ایم۔این۔اے بنے، وفاقی وزیر کے عہدہ پر فائز رہے اقتدار ان کا طواف کرتا رہا، اللہ نے انہیں عزت بھی دی، شہرت بھی دی، انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ یہ سب کچھ کرتے اور اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے۔ ایک روز میں براہ راست اُن سے پوچھوں گا کہ عہدہ اللہ کی دین ہوتا ہے اور بڑی آزمائش بھی۔ یہ دوستوں سے وفاداری بھی سکھاتا ہے لیکن انہوں نے ہم سے بدعہدی کیوں کی۔''

مشاہد حسین سید سینیٹر بھی تھے اور قابلِ اعتماد ساتھی بھی تھے وہ وزارت اطلاعات اور نشریات کے انچارج وزیر تھے وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے نواز شریف کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ میں اسلام آباد سے لاہور بذریعہ ہوائی جہاز آ رہا تھا میری نشست مشاہد حسین صاحب کے ساتھ تھی۔ گفتگو کے دوران انہوں نے میاں نواز شریف صاحب پر تنقید شروع کر دی اور کہا کہ جب میں دو سال تک زیرِ حراست تھا تو نواز شریف صاحب نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ کیا اور پھر سعودی عرب روانگی کے بعد بھی میرا حال نہ پوچھا اور کیا جس جہاز میں وہ گئے تھے اُس میں میرے لیے ایک سیٹ بھی نہیں تھی۔

کچھ عرصہ بعد جدہ میں دورانِ گفتگو میں نے مذکورہ بالا خیالات جناب نواز شریف کے گوش گزار کیے تو انہوں نے کہا مشاہد صاحب اچھے آدمی ہیں مگر اُن کے گلے شکوے بے جا ہیں میں تو خود ایک سال تک قید میں تھا، اُن سے کیسے رابطہ کرتا۔ شہباز صاحب بھی حراست میں تھے وہ بھی کیسے اُن سے ملتے۔ ہمیں تو جبری

طور پر جلاوطن کیا گیا تھا اور ہمارے پاس کسی کو ساتھ لے جانے کا اختیار موجود نہ تھا اگر ہوتا تو اُن کی نشست پکی ہوتی۔ نشست کی فراہمی کا سوال تو انہیں ان لوگوں سے کرنا چاہیے جن کے ساتھ وہ شریک حکومت ہیں۔'' اس بات کے اختتام پر میاں نواز شریف کے چہرے پر رنج کا غبار پھیل گیا۔

شیخ رشید احمد آف راولپنڈی کی سیاست اور بازی گری سے پاکستان کے عوام اچھی طرح آشنا ہیں۔ نواز شریف نے انہیں اہم وزارتیں سونپے رکھیں لیکن وہ ایک ہی جست میں جنرل مشرف کی ٹیم میں شامل ہوگئے۔ شاید وہ نواز شریف کے دیرینہ ساتھیوں میں اول لوٹے ہیں۔ جدہ میں اُن کے ذکر پر میاں نواز شریف کے چہرے پر زہر خند اُبھر آیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا شیخ رشید نامعقول آدمی ہے اُس نے کسی قدر یا روایت کی پاس داری نہیں کی وہ بیس سال تک مجھے اپنا قائد اور رہنما کہتے رہے۔ میرے ساتھ بے وفائی کر کے انہوں نے اپنی ذات کا اظہار کر دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا میں فوج کی حراست میں تھا۔ بیگم کلثوم نواز بحالی جمہوریت کے لیے باہر نکلیں اُن کے ملک گیر دورے حکمرانوں کے اعصاب پر سوار تھے سیاست میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ ان دنوں شیخ رشید پاکستان کے واحد شخص تھے جنہوں نے میری اہلیہ کے بارے میں نازیبہ کلمات کہے۔ جیل کی دیواروں کے اندر مجھ تک جب یہ الفاظ پہنچے تو مجھے شدید رنج ہوا۔ شیخ رشید نے بیگم کلثوم نواز کی تحریک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ شیخ صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے اظہار یکجہتی کیا اور پھر مکر گئے حتی کہ آخری الیکشن میں بھی میرا نام استعمال کیا عوام کو دھوکا دیا اپنے حلقے کے لوگوں سے کذب بیانی کی لاکھوں انسانوں کے سامنے وعدہ کیا کہ مجھے نواز شریف کے نام پر ووٹ دیں میں یہ سیٹ جیت کر نواز شریف کے قدموں میں رکھ دوں گا۔ سیٹ جیت کر انہوں نے جنرل مشرف کے قدموں میں ڈال دی اور پھر خود بھی وہیں لیٹ گئے۔ ایسے لوگ ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں وہ عوام کے دل سے اُتر گئے ہیں اور جن کی

نوکری کر رہے ہیں وہ بھی انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

میاں نواز شریف آہستہ آہستہ یہ بات کہہ رہے تھے اور مجھے شیخ رشید صاحب سے وابستہ ایک واقعہ یاد آرہا تھا جو ہمارے ایک مشترکہ دوست نے سنایا تھا وہ دوست کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ نواز شریف کو قیمتی گھڑیاں پہننے اور جمع کرنے کا شوق ہے وہ جب کبھی یورپ، امریکہ، دبئی، ایران یا سعودی عرب جاتے تو اپنی جیب سے قیمتی گھڑیاں خریدتے۔ میرے دوست نے بتایا کہ شیخ رشید کئی بار نواز شریف کا بازو پکڑ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ آپ میرے محبوب قائد ہیں، مجھے نشانی کے طور پر اپنی یہ گھڑی عنایت فرما دیں۔ اس طرح فرزندِ راولپنڈی نے نواز شریف سے کئی قیمتی گھڑیاں اینٹھ لیں۔

نواز شریف کے دور کے ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جینس بیورو کرنل ریٹائرڈ اقبال نیازی جو بارہ اکتوبر 1999ء کو گرفتار کر لیے گئے تھے اُن کے بارے میں نواز شریف اچھی رائے رکھتے تھے اور انہیں ایک وفادار اور سادہ لوح شخص قرار دیا۔

میاں نواز شریف نے اپنے سابق قریبی دوست اور پنجاب کے سابق گورنر میاں محمد اظہر کے بارے میں بات کرتے ہوئے صرف اتنا کہا: ''میاں صاحب نے عمر بھر کی دوستی لمحوں میں لٹا دی جس کا مجھے صدمہ ہے۔ ان کو ان کے کیے کی سزا مل گئی ہے مجھ سے بے وفائی کرنے والے کے ساتھ اُن کے دوستوں اور سرپرستوں نے وہی سلوک کر دیا۔ اُس سے بڑھ کر یہ کہ لاہور شہر کے عوام نے اُن کو اُن کے حمایت یافتہ امیدواروں کو بھی الیکشن میں ہروا دیا۔''

میں صاحب جب بھی اپنے دوستوں کی بے وفائی کا ذکر کرتے تو بڑے جذباتی ہو جاتے اور کہتے: ''یہ لوگ اپنی منزل کھو چکے ہیں اپنا عزت و احترام اور مقام بھی گنوا چکے ہیں اور اسی لیے عوام نے انہیں مسترد کر دیا ہے۔''

ذکر چند اخبار نویسوں کا

جیسا کے گذشتہ ابواب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ سرور پیلس کی مجالس میں پاکستان کے اخبارات پڑھے جاتے، کالموں اور کالم نگاروں کا ذکر ہوتا۔ ایڈیٹر صاحبان کی بات ہوتی۔ نواز شریف کوئی کالم پڑھ کر سنائے جاتے اس پر وہ خود بھی تبصرہ کرتے اور دیگر شرکائے محفل افراد سے بھی رائے طلب کرتے۔ کبھی خلافِ واقعہ یا حقیقت کے منافی لکھے جانے والے کسی کالم کے بارے میں بحث ہوتی اور کبھی مقتدر قوتوں کے اشارے پر شائع ہونے والی خبروں کا پوسٹمارٹم ہوتا۔ اس سارے عمل کے کئی اثرات دیکھنے میں آتے۔ میں اکثر ان لمحات میں نواز شریف کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا جب کوئی پروپیگنڈہ پر مبنی کالم، حقائق کے برعکس تجزیہ یا ٹیبل سٹوری پڑھ کے سنائی جاتی عام طور پر کوئی ردِعمل ظاہر کرتے اور نہ اُن کے چہرے پر کوئی تاثر اُبھرتا۔ گذشتہ برسوں میں سیاست گری، اقتدار اور پھر اس سے محرومی اور اپوزیشن کے کردار کے علاوہ جلاوطنی کے سخت ایام نے انہیں یہ سکھا دیا ہے کہ اپنے جذبات اور احساسات کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ اب اس فن میں میاں صاحب یکتا ہیں اور ایک خاموش سمندر کی طرح اپنی تہہ میں ہزاروں راز لیے بیٹھے ہیں۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ محض ان کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر اُن کے اندرونی جذبات اور دل میں برپا تلاطم کا اندازہ کر سکے، تو میرا خیال ہے وہ اس میں ناکام رہے گا۔

میں ان دنوں جدہ ہی میں تھا جب ممتاز دانشور اور پاکستان کے بزرگ اخبار نویس جناب مجید نظامی نواز شریف سے ملنے تشریف لائے۔ نوائے وقت گروپ آف پبلیکیشنز کے مالک اور چیف ایڈیٹر ہونے کے ناطے اور پاکستان مسلم لیگ سے

قلبی تعلق نے انہیں پاکستان بھر میں ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کر رکھا ہے۔ اُن کی سرور پیلس آمد پر نواز شریف بہت خوش تھے۔ نواز شریف اور اُن کے والد میاں محمد شریف (مرحوم) کے بھی مجید نظامی صاحب سے گہرے اور درینہ تعلقات ہیں۔ بعض ذرائع کے مطابق جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انہوں نے مجید نظامی صاحب کو صدرِ پاکستان بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جسے نظامی صاحب نے بڑی محبت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

قید اور جلاوطنی کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد نواز شریف صاحب کی یہ مجید نظامی صاحب سے پہلی ملاقات تھی یہ بند کمرے میں ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس میں کوئی تیسرا فرد شریک نہ تھا۔ بعد ازاں کچھ اور افرادِ خانہ اس میں شریک ہو گئے تھے۔

جناب مجید نظامی رخصت ہو گئے تو شام کی محفل میں ہر شخص یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ اُن سے کیا باتیں ہوئیں۔ نواز شریف صاحب نے اس مجلس میں جناب مجید نظامی کے کردار، شخصیت اور صحافتی افکار و نظریات کی بے حد تعریف کی اور کہا: ''میں نے ہمیشہ نظامی صاحب سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اُن کے مشوروں کو اولیت دی ہے۔ وہ بھی فوجی اور مطلق العنان طرزِ حکمرانی کے سخت مخالف ہیں اور میں بھی اُن کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ نظامی صاحب نے اس ملاقات میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ساری مسلم لیگیں متحد ہو جائیں۔ یہی پاکستان کے مفاد میں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہ اتحاد کر لیا جائے۔'' نواز شریف نے مزید کہا: ''میں نے یہ سنا اور پھر خاموشی اختیار کر لی کیونکہ میرے لیے بے وفا دوستوں اور غداروں سے اتحاد کرنا ایک مشکل کام تھا۔

ان شبینہ مجالس میں روزنامہ پاکستان، ہفت روزہ زندگی اور ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر اور معروف کالم نگار جناب مجیب الرحمٰن شامی کا ذکر بھی ہوتا رہا ہے۔ نواز شریف صاحب، جناب مجیب الرحمٰن شامی کا ذکر ہمیشہ عزت واحترام سے کرتے اور کہتے کہ: ''اُن کے صائب مشورے دلیل سے بھرپور ہوتے ہیں۔ سیاسی سوجھ بوجھ میں مہارت رکھتے ہیں۔ تحریر اور تقریر دونوں پر اُن کی دسترس ہے۔ میں اکثر اُن سے سیاسی امور اور میڈیا کے حوالے سے معاملات میں مشورہ کرتا تھا۔ انہوں نے بعض اخبارات سے غلط فہمیوں کی بنیاد پر جھگڑے کو بہت احسن طریقے سے ختم کروانے کی کوشش کی۔''

میں اُس روز بھی سرور پیلس ہی میں تھا جب پاکستان کے ایک اور معروف اخبار نویس زاہد ملک نواز شریف صاحب سے ملنے آئے۔ وہ اسلام آباد اور حکومتی حلقوں میں بہت معتبر ہیں۔ پاکستان آبزرور اور ہفت روزہ حُرمت کے چیف ایڈیٹر ہیں اُن کی روانگی کے بعد نواز شریف نے بتایا: ''زاہد ملک صاحب حکمرانوں کا پیغام لے کر آئے تھے اور وہ یہ کہ اگر میں جنرل پرویز مشرف کو صدر مان لوں اور اُن کے ساتھ چلنے کی حامی بھر لوں تو مجھے اور میرے اہل خانہ کو مراعات دی جا سکتی ہیں لیکن میں نے زاہد ملک صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم کسی مراعات کے خواہاں نہیں ہیں اور ہم اپنا حق خیرات میں نہیں مانگیں گے میں نے اُن سے بصد احترام کہا کہ آپ جنرل مشرف کو میرا بھی پیغام پہنچا دیں کہ وہ آئین کی حکمرانی کو تسلیم کر لیں اور آئین کی بے حرمتی پر توبہ کر لیں۔ مطلق العنانیت کا خاتمہ کر دیں، فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے تو ہماری اور آپ کی صلح ہو سکتی ہے۔ یہی ملک کے لیے بہتر ہے۔''

ایسی ہی شام کی مجالس میں جناب نواز شریف نے معروف کالم نگاروں جناب عرفان احمد صدیقی اور پروفیسر عطاالرحمٰن کو جرأت مند، حق گو اور راست باز صحافی قرار دیا اور کہا کہ وہ ہمیشہ حکومتی دباؤ کا شکار ہوئے بغیر بہت پر اثر طریقے سے حقیقت بیان کرتے ہیں جو دلوں پر اثر کرتی ہے۔ یہ دونوں حضرات وضع داری کے امین ہیں۔"

رؤف طاہر ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار صحافی ہیں۔ انہوں نے کئی برس تک پاکستان میں اپنی تحریروں کا جادو جگایا اور پھر سعودی عرب چلے گئے۔ آج کل ہفت روزہ اُردو میگزین کے مدیر ہیں۔ باقاعدگی سے سرور پیلس کی محفلوں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ نواز شریف نے اُن کے بارے میں کہا: "کہ وہ پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں اور حرفِ حق لکھنا اُن کی عادت ہے۔

جنگ کے معروف کالم نگار اور بہت سینئر صحافی جناب ارشاد حقانی کے بارے میں انہوں نے کہا: "وہ بڑا اسخت تجزیہ کرتے ہیں اور ہمیشہ لگی لپٹی رکھے بغیر حقیقت کا اظہار کرتے ہیں اور اُن کی جمہوریت سے محبت بھی ہے اُن کا مؤقف مجھے بہت پسند ہے جس میں وہ ہمیشہ میرے اور بینظیر صاحبہ سمیت تمام رہنماؤں کی وطن واپسی کا مطالبہ کر کے شفاف الیکشن منعقد کرانے کی تجویز پر زور دیتے ہیں۔"

ہر دلعزیز کالم نگار جناب عطاالحق قاسمی کے بارے میں اُن کا کہنا تھا: "وہ ایک نظریاتی اور وفادار کالم نگار ہیں اُن کے کالم دلچسپ اور پر اثر ہوتے ہیں وہ نہایت خوبصورتی سے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں اُن کے خوبصورت فقروں پر انسان مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اُن کی خوبیوں سے متاثر ہو کر انہیں پہلے ناروے

اور پھر تھائی لینڈ میں سفیر مقرر کیا تھا۔ وہ اب بھی کلمۂ حق کا علم تھامے ہوئے ہیں۔“

مقتدر قوتوں اور بندوق والوں نے میاں نواز شریف کو جبراً جلاوطن کر کے یہ سوچا تھا کہ اُن سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ اس قبل جنرل ضیاء الحق نے بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو سے جان چھڑا کر یہ سوچا تھا کہ بھٹو، بھٹوازم اور پیپلز پارٹی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور اب وہ سکون سے اقتدار کے ایوانوں میں براجمان رہیں گے۔ لیکن نہ تو بھٹو صاحب کو تختہ دار پر لٹکا کر جنرل ضیاء الحق کو چین ملا اور نہ ہی جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو جلاوطن کر کے سکون پایا۔

نواز شریف جدہ اور اب لندن میں بیٹھ کر مسلسل جنرل پرویز مشرف کے اعصاب پر سوار ہیں اور جنرل مشرف طوفان زدہ کشتی میں سوار ہیں۔

ایک روز سرور پیلس میں مجلس برپا تھی۔ نواز شریف نمازِ مغرب کی ادائیگی کے بعد سرِ محفل تھے گزرے دنوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لاہور سے آئے ہوئے ایک مہمان نے جناب شہباز شریف کی تعریف کی اُن کے طرزِ حکمرانی اور اصلاحات کی خوبیاں بیان کیں۔ چند اور مہمان بھی اس میں شریک ہو گئے اور کہا کہ پنجاب کی تاریخ میں جناب شہباز شریف جیسا وزیر اعلیٰ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ انہوں نے بیوروکریسی کے بے لگام گھوڑے کو قابو کیا۔ جرائم کی روک تھام کی۔ امتحانوں میں نقل بند کروائی۔ مذہبی دہشت گردوں کو آہنی ہاتھوں سے نمٹا، گھوسٹ سکولوں کا خاتمہ کیا۔ جعلی ادویات کا خاتمہ کیا، ریکارڈ وقت میں مختلف شہروں میں نئی سڑکیں اور پل بنوائے اُن میں سٹریٹ لائٹس لگوائیں، میرٹ کا تحفظ کیا، اقربا پروری کا خاتمہ کیا، انصاف کی فراہمی کے لیے تمام ممکن اقدامات کیے، سیاسی بلیک میلنگ اور

کسی بھی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا...... ابھی تعریف و توصیف کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ نواز شریف صاحب کے دائیں جانب بیٹھے سہیل ضیاء بٹ نے بلند آواز سے کہا: ''یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ سب کچھ تب ہی ممکن ہے جب بڑا بھائی وزیراعظم ہو پھر چھوٹے بھائی کی وزارتِ اعلیٰ کی طاقت کو کون چیلنج کر سکتا ہے''۔ ان الفاظ سے مجلس میں چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، لیکن نواز شریف نے فوراً کہا: ''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں شہباز صاحب نے بڑی مردانگی اور انتھک محنت سے پنجاب میں حکومت کی ہے انہوں نے بے شمار ایسے کام کیے ہیں جن کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں ملتی۔ مندرجہ بالا تمام کارنامے انہی کا حصہ ہیں۔ انہوں نے دن رات جاگ کر یہ کام کیے ہیں۔''

میاں نواز شریف نے بڑے احسن انداز میں بھائی کی دل جوئی کی تھی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میاں شہباز شریف نے میاں نواز شریف کو ہمیشہ اپنا بھائی، قائد اور وزیراعظم تسلیم کیا ہے اور اُن سے محبت وفاداری اور وفا شعاری کا ثبوت دیا۔

میرے سامنے کئی بار جناب شہباز شریف نے کہا ہے: ''کہ اصل لیڈر تو نواز شریف ہیں۔ انہی کا ووٹ بنک ہے اور وہ ہی ملک کے نجات دہندہ ثابت ہونگے۔'' بہت سے افراد، قوتوں اور اہم حکومتی اہلکاروں نے دونوں بھائیوں کے درمیان غلط فہمی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور انہیں تصادم پر آمادہ کرنے میں لگے رہے اور اسے اپنے ذرائع سے میڈیا تک بھی پہنچایا لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ کبھی کبھار میاں شہباز شریف کو اقتدار میں لانے کی خبریں اُڑائی جاتی تھیں وہ دراصل اسی منصوبہ کا حصہ تھا لیکن شریف خاندان نے بڑی جرأت اور حکمت سے اسے ناکام

سندھ کے سابق گورنر ممنون حسین، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مہتاب عباسی، سابق وفاقی وزیر جناب جعفر اقبال، اُن کی بیگم عشرت اقبال، محترمہ تہمینہ دولتانہ، محترمہ سعدیہ عباسی، سابق گورنر پنجاب جناب ذوالفقار کھوسہ، جناب انعام اللہ نیازی اور سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ پیر صابر شاہ کے بارے میں نواز شریف نے کہا: ''کہ یہ لوگ ہر امتحان میں پورے اُترے ہیں اور میرے جانثار ساتھی ہیں جمہوریت کے لیے ان کی خدمات قابلِ تعریف ہیں اور میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں۔''

جدہ کی شام کی ایک محفل میں میں بھی سابق وفاقی وزیر جناب چوہدری نثار علی خان کے ہمراہ عشائیہ پر مدعو تھا۔ کھانے کے دوران سیاسی بحث جاری تھی جناب نثار علی بڑے مدلل اور مضبوط انداز میں اپنی سیاسی تھیوری پیش کر رہے تھے اور پاکستان میں موجود مسلم لیگ (ن) کے ارکانِ اسمبلی اور دیگر رہنماؤں کو درپیش مشکلات کا اجمالی جائزہ لے رہے تھے اور نئی حکمت عملی ترتیب دینے کے لیے تجاویز پیش کر رہے تھے۔ اگلے دن شام کی محفل میں نواز شریف نے چوہدری نثار کے بارے میں کہا: ''کہ وہ ایک بااعتماد اور دانشور دوست ہیں اور فوجی حکمرانی کے خلاف اُن کی جدوجہد نہایت شاندار رہی ہے۔ 1973ء کے آئین کی پاسداری اور جمہوریت کے تحفظ کے لیے انہوں نے بڑے مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا۔''

ایک اور محفل میں جناب نواز شریف نے مخدوم جاوید ہاشمی (سابقہ وفاقی وزیر) کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: ''انہوں نے فوجی حکمرانی کے خلاف تاریخی کردار ادا کیا ہے جرأت اور بہادری سے آمر کو للکارا ہے۔ اُن کی تقریروں سے حکمران خوف زدہ تھے اور ہیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ نواز شریف، جاوید ہاشمی کے کردار سے بہت متاثر ہیں اور ان کے معترف ہیں اور وہ جاوید ہاشمی کے رویے کو مسلم لیگ

کے باقی رہنماؤں کے لیے ہی قابل تقلید قرار دیتے ہیں۔ وہ جیل اور عدالتوں میں جاوید ہاشمی سے کیئے جانے ناروا سلوک پر اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کرتے رہے۔ نواز شریف سے خود بھی وطن عزیز کی جیلوں اور عدالتوں میں جو سلوک کیا گیا تھا اور جو رویہ اختیار کیا گیا تھا اس سے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مخدوم جاوید ہاشمی پر کیا گزر رہی ہے۔

مخدوم جاوید ہاشمی کے ساتھ ساتھ نوجوان مسلم لیگی راہنما خواجہ سعد رفیق اور سید زعیم قادری کی خدمات کو سراہتے ہوئے جناب نواز شریف نے کہا: ''کہ یہ نوجوان مسلم لیگ (ن) کا قابل فخر سرمایہ ہیں اور انہوں نے جمہوریت کا علم تھامے رکھا ہے اور بڑے سنگین وقت میں اہم کردار ادا کیا ہے''۔ جابرانہ ماحول اور ہتھکنڈوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر ان دونوں نے نواز شریف کے دل میں جگہ بنالی ہے اور وہ جدہ میں رہ کر بھی اُن سے دور نہیں تھے۔

نواز شریف نے مسلم لیگ کے سینئر راہنما راجہ ظفر الحق کی ہمیشہ تعریف کی اور انہیں ایک مدبر، متوازن اور محبّ وطن شخص قرار دیا اور کہا: ''وہ ہمارا اثاثہ ہیں اور اُن کے مشورے ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ فوجی حکمرانوں کی مختلف پیش کشوں اور چالوں کے باوجود وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے''۔

ایک اور شخص جن کے بارے میں نواز شریف نے ہمیشہ بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا اُن کا نام ظفر اقبال جھگڑا ہے اور وہ مسلم لیگ (ن) کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ میں نے بارہا نہ صرف نواز شریف کو اُن کی تعریف کرتے سنا بلکہ کئی اہم امور پر ان سے تفصیلی مشورہ کرتے بھی دیکھا ہے۔ وہ ایک حلیم الطبع، شریف النفس اور سیدھے

سادھے انسان ہیں۔ تکبر قریب سے نہیں گزرا۔ نواز شریف سے محبت اور اطاعت اُن کا سرمایہ ہے۔ میں کئی بار کئی مسائل پر نواز شریف صاحب سے گفتگو کی تو انہوں نے ظفر اقبال جھگڑا صاحب سے مشورہ کرنے اور راہنمائی حاصل کرنے کے لیے کہا اور میں نے جب بھی نواز شریف صاحب کی ہدایت پر اُن سے رابطہ کیا انہوں نے انتہائی محبت اور خندہ پیشانی سے مشورے دیے۔

جناب احسن اقبال، نواز شریف کے پرانے جانثار ہیں۔ نواز شریف اُن کی ذہانت، کارکردگی اور دور بینی کے مداح ہیں اور اُن کے مشوروں اور تجاویز کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اُن سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہ نواز شریف کے تھنک ٹینک کا اہم جزو ہیں۔

ان دوستوں کے علاوہ جناب نواز شریف نے اکثر ملاقاتوں میں غلام دستگیر خان صاحب، جناب صدیق الفاروق، ملک شجاع، بلال یٰسین، مجتبیٰ شجاع الرحمٰن اور ملک پرویز (ایم۔این۔اے) کی بھی بہت تعریف کی اور کہا: ''جمہوریت کی بحالی کی تحریک میں ان سب کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔''

This page is empty

جو وفاداری بدل گئے

وفادار دوستوں اور ساتھیوں کے ذِکر کے ساتھ ساتھ جناب نواز شریف کی محفل میں اُن لوگوں کا تذکرہ بھی ہوتا تھا جو بے وفائی کر گئے دوستی کو بھول گئے، لالچ، دباؤ یا خوف میں آ کر ساتھ چھوڑ دیا۔ اُن دوستوں کا ذکر بھی ہوتا جو اقتدار کے دوران جناب نواز شریف کی خدمت اور محبت کا دم بھرتے مگر حالات بدلتے ہی نواز شریف کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ایک شام نواز شریف صاحب سے گفتگو جاری تھی محفل اپنے عروج پر تھی پاکستان کے معروف ماہر امراض دل ڈاکٹر شہریار احمد شیخ کا ذکر چل نکلا۔ وہ نواز شریف کے چوتھے بھائی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور میاں شریف صاحب انہیں اپنا چوتھا بیٹا سمجھتے اور کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب معالج بھی تھے اور معتمد ساتھی بھی۔ جس رات فوج نے جمہوریت کا خاتمہ کیا اُسی روز ڈاکٹر شہریار بھی شریف خاندان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فوجی انقلاب سے چند دن بعد میاں شریف صاحب کی طبیعت سخت خراب تھی۔ وہ عارضۂ دل میں مبتلا تھے اور ڈاکٹر شہریار اُن کے واحد بااعتبار ڈاکٹر تھے انہیں بار بار فون کر کے بلایا گیا لیکن انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے گھر کے باہر فوج تعینات ہے۔ مارشل لاء لگا دیا گیا ہے میرا آنا ممکن نہیں۔ یہ سن کر میاں شریف صاحب دم بخود رہ گئے اور کہا کہ شریف میڈیکل سٹی سے ڈاکٹر عدنان خان کو طلب کیا جائے وہ ایک ہی فون پر تشریف لے آئے اور طبی امداد فراہم کی طبیعت سنبھلنے پر میاں شریف صاحب نے اہل خانہ سے کہا کہ دوبارہ کبھی ڈاکٹر شہریار شیخ صاحب کو تکلیف نہ دی جائے۔ اس واقعہ کے بعد ڈاکٹر عدنان اُن کی طبی دیکھ بھال کرتے رہے اور اُن کے ساتھ سعودی عرب بھی گئے

میاں شریف صاحب کی وفات تک اُن کے ساتھ رہے اب بھی وہی مقیم ہیں۔ سرور پیلس کے مکین اب بھی اُن سے استفادہ کررہے ہیں۔ طبی سہولتوں کی فراہمی کے علاوہ وہ نواز شریف صاحب کے دفتری امور میں بھی شریک رہتے ہیں۔

اسی حوالے سے ڈاکٹر معظم بیگ مرزا جو کہ میاں شریف صاحب کے معالج بھی تھے اور اتفاق ہسپتال میں اپنی مسیحائی کے جوہر دکھاتے تھے۔ فوج کے آتے ہی اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اُن کے ایک بھائی یوسف بیگ مرزا جنہیں پاکستان ٹیلی ویژن کا مینیجنگ ڈائریکٹر بھی لگایا گیا تھا بے وفائی کر گئے۔

لاہور کے نزدیک قصبہ 'شرقپور شریف' میں مقیم پاکستان کے مشہور گدی نشین صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری بھی نواز شریف کو جدہ میں ملتے رہے میرے سامنے وہ اُن سے عہدِ وفا کرتے رہے۔ نواز شریف ہمیشہ اُن کی تعریف کرتے اور اُن کے والد کی دینی خدمات کا ذکر کرتے اور کہتے: ''وہ ہمارے قابلِ فخر ساتھی تھے اُن کے والد نے اُن کی بہت اعلیٰ تربیت کی لیکن نہ جانے کیوں وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔'' اور خود ہی جواب دیتے ''غالباً دباؤ اتنا بڑھ گیا ہوگا اب اُن کی برداشت سے باہر ہوگیا ہوگا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

لاہور سے تعلق رکھنے والے میاں منیر احمد، اختر رسول، کامل علی آغا، میاں عبدالستار اور دیگر افراد کی بے وفائی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے: ''مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ افراد یہ رویہ اختیار کریں گے اور ہر وقت مجھے وفاداری اور محبت کا یقین دلانے والے یوں اجنبی ہو جائیں گے۔ میں جب بھی لاہور آتا وہ ہر وقت میرے اردگرد موجود ہوتے تھے۔''

دوست، دوست نہ رہے

یہ 14 اگست 2005ء کی بات ہے جدہ سرور پیلس میں حسبِ معمول محفل جاری تھی۔ پاکستانی اخبارات کے تراشے نواز شریف کے سامنے رکھے تھے۔ چیدہ چیدہ کالم پڑھے جا رہے تھے جو خبر سب سے زیادہ دلچسپی سے پڑھی گئی وہ ملتان اور شجاع آباد کے تین اہم سیاستدانوں اور مسلم لیگ (ن) کے رہنماؤں کے بارے میں تھی۔ جناب حافظ اقبال خاکوانی (سابق وزیر صحت پنجاب)، جناب طاہر رشید (سابق ایم۔این۔اے) اور جناب جاوید شاہ (سابق ایم۔این۔اے) نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر حکومتی لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔

یہ سب لوگ قابلِ اعتماد ساتھی تھے مگر انہوں نے یہ غیر دانشمندانہ اقدام اٹھایا اور نہ جانے کیوں ایک غیر سیاسی اور غیر اخلاقی فیصلہ کیا۔

جناب نواز شریف نے خبر سنی تو کسی گہری سوچ میں چلے گئے اور پھر خاصے لمبے وقفے کے بعد بولے: ''میں نے ان لوگوں سے کوئی زیادتی نہیں کی تھی انہیں بڑی پیار سے ساتھ رکھا اور اُن پر ہمیشہ اعتماد کیا لیکن انہوں نے یہ کیا کیا۔ فوجی حکومت کے بعد حافظ اقبال خاکوانی کئی بار جدہ تشریف لائے، میرے پاس قیام بھی فرمایا میں نے انہیں ہمیشہ گھر کے فرد کی حیثیت سے جانا اور محبت واحترام سے پیش آیا۔ وہ جدہ میں جب بھی میرے ساتھ سرور پیلس میں قیام کرتے تو مجھے ہمیشہ ایسی قرآنی آیات چن چن کر سناتے جن میں وعدہ پورا کرنے کا ذکر ہوتا وہ حافظ قرآن ہیں اس لیے محفل کے آغاز اور اختتام پر میں تلاوت کلام پاک کرتے پھر کھانے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز میں دعا کرواتے لیکن اُن کے اس فعل نے مجھے حیران کر

دیا ہے۔ جاوید شاہ اور طاہر رشید بھی ہمیشہ مجھے بتاتے کہ وہ تمام فیصلوں کے لیے حرم نبوی ﷺ میں استخارہ کرتے ہیں شاید اس بار بھی وہ یہی بات کہیں۔

نواز شریف یادوں کے اوراق پلٹ رہے تھے تو بار بار ان تینوں حضرات کے مختلف بیانات میرے دماغ میں گونج رہے تھے جن میں وہ اس بات کا عہد کرتے تھے کہ وہ نواز شریف کی فوج کے جانثار سپاہی ہیں۔ نواز شریف کہہ رہے تھے: ''وہ سب لوگ جو انہیں داغ مفارقت دے گئے ہیں وہ ایک روز پچھتائیں گے اور سرکاری لیگ میں عزت سے محروم رہیں گے انہیں صرف استعمال کیا جائے گا اور پھر فارغ کر دیا جائے گا۔ وہ واپس آنا چاہیں گے تو ان میں سے اکثر لوگوں کو واپس مسلم لیگ (ن) میں قبول نہیں کیا جائے گا۔

مہمان علمائے کرام

سرور پیلس کے قیام کے دوران متعدد مذہبی راہنماؤں نے جناب نواز شریف سے ملاقاتیں کیں۔ اُن میں جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد، جمعیت العلمائے اسلام کے امیر جناب مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق اور حافظ حسین احمد، پروفیسر ساجد میر کے علاوہ لاتعداد علمائے کرام شریک ہیں۔ نواز شریف ایک وضع دار اور مہمان نواز آدمی ہیں۔ قاضی حسین احمد صاحب کے جارحانہ اور سخت رویے اور بیانات کے باوجود وہ اُن کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اکثر محفلوں میں جماعت اسلامی اور قاضی حسین احمد صاحب سے خصوصی افہام تفہیم کی تلقین کرتے ہیں اور اُن کے بیانات کے جواب میں خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کو بھی عالم دین کی حیثیت سے خصوصی مقام دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''کہ میں نے ہمیشہ حکومت یا اپوزیشن دونوں ادوار میں ان سے رابطہ نہیں ٹوٹنے دیا اور صلاح ومشورہ جاری رکھا۔'' پروفیسر ساجد میر صاحب کی تعریف کرتے ہوئے نواز شریف نے کہا: ''وہ ایک عالم ہیں اور اُس کے مقام سے پوری طرح آگاہ ہیں۔''

میرے سامنے حافظ حسین احمد صاحب دو بار نواز شریف صاحب سے ملے ایک بار بہت شروع میں جبکہ وہ جنرل پرویز مشرف کے معترف تھے اُن کے اقدامات کے حامی تھے اور وہ مشرف صاحب کے سیاسی اور سماجی انقلاب کے منتظر بھی تھے۔ اُن کی نہایت سخت باتوں کے باوجود نواز شریف نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا دراصل حافظ صاحب کہہ رہے تھے کہ نواز شریف صاحب اپنی مرضی سے پاکستان سے آئے

ہیں وہاں رہ کر جدوجہد کرتے۔ اس کے بعد بھی نواز شریف صاحب نے اُن کی امامت میں نمازِ مغرب ادا کی۔

میری موجودگی میں میاں نواز شریف کی حافظ حسین احمد سے دوسری ملاقات نومبر 2005ء میں ہوئی حسبِ سابق شام کی محفل میں خیال آرائی ہوئی جناب چوہدری نثار علی خان، اسحاق ڈار صاحب، حسین نواز شریف صاحب اور دیگر عمائدین بھی شریک محفل تھے اس بار حافظ حسین احمد کی سوچ بدل چکی تھی اور وہ جنرل پرویز مشرف اور اُن کی پالیسیوں پر عدم اعتماد کا اظہار فرمارہے تھے۔ جنرل صاحب کی وعدہ خلافی پر ناراض تھے۔ بلوچستان اور شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن پر برافروختہ تھے۔ شام کی محفل کے بعد اُن کی امامت میں نمازِ عشاء ادا کی گئی اور اس کے بعد سب مہمان کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران پھر سیاسی گفتگو کا آغاز ہوا۔ جناب نثار علی خان، جناب اسحاق ڈار، جناب سہیل ضیاء بٹ، حافظ حسین احمد صاحب اور نواز شریف صاحب تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو کرتے رہے۔ حافظ حسین احمد جنرل مشرف پر برس رہے تھے میں نے صدر محفل جناب نواز شریف سے اجازت لے کر حافظ صاحب سے چند سوال پوچھے۔ مثلاً یہ کہ آپ کی اور ایم ایم اے کی حمایت ہی سے جنرل مشرف صدر بنے ہیں اور پھر آپ کی مدد سے ہی بدنام زمانہ سترویں آئینی ترمیم منظور ہوئی ہے۔ آپ لوگوں نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے اور پھر جنرل مشرف کی ٹیم میں شامل ہوگئے اس سے نہ صرف آپ نے ایک فوجی جرنیل کو آئینی تحفظ دیا ہے بلکہ ملک کے آئین میں بھی تباہ کن ترمیم شامل کرڈالی ہے ان فیصلوں سے آپ کے ووٹروں کا آپ پر اعتماد اُٹھ گیا ہے اور آپ کا بطور عالم دین احترام بھی بری طرح مجروح ہوا ہے۔ میرے یہ

سوالات سنتے ہی حافظ حسین احمد صاحب غصہ میں آ گئے اور جواب دینے کے بجائے میرا تعارف طلب کیا میں نے اپنا نام اور اُن کے ایک عزیز حافظ خلیل احمد صابر سے اپنا تعلق بیان کیا تو انہوں نے سختی سے میرے سوالات کو مسترد کر دیا اور کہا کہ ہم مشرف کے اس لیے خلاف ہو گئے ہیں کہ انہوں نے گزشتہ سال وعدہ کرنے کے باوجود اپنی وردی نہیں اُتاری اور ہم یہ اُتار کر ہی رہیں گے۔ میں نے پھر کہا اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میری بات سن کر جناب نثار علی خان ہنسے اور کہا لو بھئی ہمیں لاہور میں ایک اور سمجھدار اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا ایم این اے کا امیدوار مل گیا ہے۔ جناب اسحاق ڈار نے انتہائی سنجیدگی سے کہا: ''کہ اس حد تک تو ڈاکٹر صاحب کی بات ٹھیک ہے اب آنے والے وقت میں ایم ایم اے کے فیصلے ملک کے مستقبل پر دور رس نتائج مرتب کریں گے اور امید ہے کہ ایم۔ ایم۔ اے اور اے۔ آر۔ ڈی مل کر ملکی مفاد میں فیصلے کریں گے اور ہمیشہ کے لیے ملک میں فوجی انقلاب کا راستہ روک دیں گے۔

اس گفتگو کے ساتھ ہی جب میں نے نواز شریف کے چہرے کو دیکھا تو وہ بالکل سرخ تھا انہوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور غصے اور بلند آواز میں کہہ رہے تھے: ''حافظ صاحب یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ایم ایم اے کی حمایت نے جنرل پرویز مشرف کی حکمرانی کو طوالت بخشی ہے آپ نے ایک ڈکٹیٹر اور ظالم کا ساتھ دے کر ملک سے بہت زیادتی کی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ آپ کے ان فیصلوں سے عوام کی نظر میں آپ کا احترام بھی متاثر ہوا ہے۔ علمائے کرام مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں معاشرے میں خصوصی مقام حاصل ہے لیکن افسوس کہ آپ کے اقدامات کو عوامی تائید حاصل نہیں۔ اب آپ کو عوامی احترام کے فیصلے کرنا ہونگے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔'' میں نے پہلی بار نواز شریف صاحب کو جوش میں بلند آواز

میں بات کرتے دیکھا تھا اور وہ سب میرے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ بہرحال چند ہی لمحوں ماحول پر سکون ہو گیا بحث کا انداز اور موضوع بھی بدل گیا۔

نواز شریف صاحب نے کھانے کے بعد حافظ حسین احمد سے دعا کروائی اور وہ سب مہمانوں کو چھوڑنے دروازے تک آئے تو حافظ حسین احمد صاحب نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقہ کیا اور مجھے ملاقات کے لیے کہا تاکہ وہ مجھے سیاسی طور پر بریف کر سکیں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ملنے کا وعدہ کیا اس دوران نواز شریف زیر لب مسکرا رہے تھے اور چوہدری نثار علی خان بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ماڈل ٹاؤن والے گھر پر کیا بیتی؟

مکان کی اہمیت فقط یہ نہیں ہوتی کہ یہ کتنا بڑا ہے، اس کا رقبہ کتنا ہے، اس کی تزئین و آرائش کس طرح کی گئی ہے۔ فرنیچر کس طرح کا ہے۔ ڈیزائننگ کس نے کی ہے، خرچہ کتنا آیا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کی قیمت اور اہمیت اُس کے مکین کے حوالے سے طے پائے۔ کراچی میں حضرت قائداعظمؒ کا گھر مرجع خلائق ہے۔ لیکن اُس کے اردگرد اُسی طرح کے کئی گھر بے نشان ہیں۔ سیالکوٹ کے ایک تنگ بازار میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے جس مکان میں آنکھ کھولی بچپن اور جوانی کے ابتدائی ایام گزارے۔ اُس گلی میں ہمیں ایسے بہت سے مکانات ملتے ہیں جو اُس مکان سے کہیں زیادہ خوبصورت، وسیع اور پرشکوہ ہیں لیکن کوئی اُن پر توجہ نہیں دیتا اور دنیا بھر سے لوگ صرف علامہ صاحبؒ کے گھر کو دیکھنے آتے ہیں۔ لندن کے جس مکان میں عظیم ڈرامہ نگار شیکسپیئر نے اپنی حیات مستعار کے دن گزارے اُس کے حیثیت آج بھی بکنگھم پیلس سے کم نہیں اہل علم و دانش کی نظر میں اس جھونپڑی نما مکان کی حیثیت و قیمت بڑے بڑے محلات سے زیادہ ہے۔ جہاں برطانیہ کا شاہی خاندان نسل در نسل مقیم ہے۔ تہران میں چار مرلہ کو محیط جناب آیت اللہ خمینی کا گھر دیومالائی حیثیت اختیار کر چکا ہے اگرچہ اس کا سائز شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے محل کے ایک گیراج سے زیادہ نہ تھا۔

پنجاب کے دارالحکومت لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں واقع جناب نواز شریف کے آبائی گھر کا مقابلہ علامہ اقبال کے مکان، لندن میں شیکسپیئر کے فلیٹ یا تہران میں امام خمینی کی رہائش گاہ سے تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ماڈل ٹاؤن والے گھر کی

حیثیت نواز شریف کی وجہ سے تھی۔ وہ لڑکپن میں اپنے والدین کے ہمراہ یہاں منتقل ہو گئے تھے۔ دراصل میاں نواز شریف کے والد میاں محمد شریف اور اُن کے بھائیوں نے مشترکہ کاروبار کے ساتھ ساتھ ایک ہی جگہ پر رہنے کا فیصلہ کیا تو ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک کے سامنے اور ایچ بلاک کے ساتھ تقریباً دس ایکڑ جگہ خریدی سات عدد ایک ہی جیسے گھر ساتھ ساتھ تعمیر کیے گئے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ اور ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر ہوئی یہ جگہ اتفاق کالونی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اسی کالونی کے ایک نمبر گھر میں جناب نواز شریف نے وزارت سے لیکر وزارت عظمیٰ پاکستان تک تمام دن گزارے۔ اسی گھر سے تحریک نجات اور پھر بیگم کلثوم نواز صاحبہ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی گھر کے سامنے باغ میں لگائے آہنی جنگلے بلڈوزروں سے گرائے گئے۔ مظلوم اور غریب عوام کے لیے بنائی گئی کھلی کچہری کا سٹیج بھی توڑا گیا۔ عوامی خواہشات کی علامت یہ گھر طاغوتی قوتوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر چبھنے لگا۔

میاں نواز شریف کو دوسری بار وزارتِ عظمیٰ سے ہٹایا گیا تو ماڈل ٹاؤن والا تاریخی گھر پھر جدوجہد کا امین بنا۔ کیپٹن صفدر وہاں مقیم ہو گئے اور یہ گھر نواز شریف کے چاہنے والوں کی عقیدت اور محبت کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ عملی طور نواز شریف اور ان کے اہل خانہ رائیونڈ میں واقع فارم ہاؤس میں منتقل ہو چکے تھے لیکن ماڈل ٹاؤن والا گھر اُن کی سیاست کا گڑھ اور مرکز تھا۔ یہ شہر سے قریب تھا اور عام سیاسی کارکنوں کو یہاں تک پہنچنے میں آسانی تھی۔ اسی لیے شریف خاندان نے اس سے تعلق نہیں توڑا۔ نواز شریف جیل چلے گئے مصائب و آلام کا دور شروع ہوا تو بیگم کلثوم نواز شریف نے یہیں سے احتجاجی سیاست کا آغاز کیا۔ یہ گھر مختلف النوع سرکاری ایجنسیوں کے کارندوں کے حصار میں رہنے لگا۔ وہاں آنے جانے والے ہر شخص پر

نظر رکھی جاتی اور اُس کے کوائف ریکارڈ کر لیے جاتے ۔ اُن کا تعاقب کیا جاتا۔ ہراساں کیا جاتا تاکہ کوئی دوبارہ اس گھر میں آنے کی جرأت نہ کرے۔

دن بدل گئے تھے دوست بھی آہستہ آہستہ اپنا قبلہ تبدیل کر رہے تھے۔ اُن لوگوں کی تعداد بھی کم ہو رہی تھی جو جان پر کھیل کر ماڈل ٹاؤن والے گھر جاتے تھے۔ میں ہر دو چار روز بعد اپنے گارڈن ٹاؤن میں واقع گھر سے نکل کر سیر کرتا ہوا اُس گھر کی طرف آ جاتا اور مقیم کیپٹن صفدر صاحب سے ملاقات کرتا۔ مشاہدہ کرتا کہ پرانے لوگوں میں کتنے جانثار ایسے ہیں جو جان قربان کرنے کا عہد کرتے تھے اور آج کور ہیڈ کوارٹر یا ڈویژن ہیڈ کوارٹرز میں میجر کے عہدوں کے افسران کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ وہ عظیم دوست بھی موجود تھے جو خفیہ ایجنسیوں اور فوجی افسروں کی دھمکیوں کے باوجود اس گھر میں حاضر ہوتے اور اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ میں جب بھی وہاں پر کیپٹن صفدر صاحب سے ملتا تو وہ حوصلے اور بلند ہمتی سے تمام مشکلات کا سامنا کرتے نظر آتے اُن کی ہمت اور حوصلہ توڑنے کی کوشش کی گئی لالچ دیا گیا لیکن وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ میں اکثر و بیشتر انہیں تجاویز اور مشورے پیش کرتا رہتا اور اُن کی حوصلہ افزائی بھی کرتا وہ میری بات سنتے اور محترمہ کلثوم نواز شریف تک پہنچانے کا عہد کرتے میں ان دنوں میں کئی مرتبہ کیپٹن صفدر سے ملا خدا گواہ ہے اس نوجوان نے نواز شریف کے گھر کو آباد رکھنے اور اُن کے فلاحی کاموں کو بلا روک ٹوک جاری رکھنے کے لیے اپنی ذمہ داریاں شاندار انداز میں پوری کیں ہیں۔ انہوں نے محترمہ کلثوم نواز صاحبہ کی قیادت میں جمہوریت کے لیے بے مثال جدوجہد کی شریف فیملی کے تمام مرد افراد کے پابند سلاسل کیے جانے کے بعد صرف کیپٹن صفدر ہی جیل سے باہر تھے اور وہ ہمہ وقت پوری قوت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔

یہ گھر مزاحمت کا مرکز بن گیا تھا۔ تحریک بحالی جمہوریت کا محور بن گیا تھا یہاں پر آنے والے مہمانوں کو روکنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ گاڑیاں روکنے کے لیے بڑے بڑے بلاکس رکھے گئے لیکن بیگم کلثوم نواز صاحبہ کی ہمت اور جرأت مشعل راہ بن گئی اور یہ گھر متوالوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا یہیں سے شروع کی گئی تحریک نے حکمرانوں کے اعصاب کو تہہ و بالا کر دیا اور وہ نواز شریف کو ملک سے باہر دھکیلنے کے منصوبے بنانے لگے۔ حکمرانوں کی کوشش تھی کہ محبتوں اور چاہتوں کے اس مرکز کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔

جب تک میاں نواز شریف پاکستان میں رہے کسی کو اس گھر کے خاتمے کی جرأت اور ہمت نہ ہو سکی۔ جس روز میاں صاحب کو سعودی عرب جلاوطن کیا گیا اُس کے چند ہفتوں بعد اس گھر پر سرکار نے قبضہ کر لیا اور اس پر پہرا لگا دیا گیا ستم ظریفی یہ کہ یہ گھر محکمہ سماجی بہبود کے حوالے کر دیا گیا اور آج اس میں نادار اور مستحق عمر رسیدہ افراد کے لیے (اولڈ ہوم) کے علاوہ سماجی بہبود کے کئی مراکز بنا دیے گئے ہیں۔ یہ ذاتی دشمنی کی بدترین مثال ہے۔ ماضی میں بھی شریف فیملی کی جائیداد اور فیکٹریاں قومی تحویل میں لی گئی تھیں مگر بعد میں واپس مل گئیں اور اُس کی شبانہ روز محنت سے اُس میں کئی گنا اضافہ بھی ہوا۔

8 اکتوبر 2005ء کا ہلاکت خیز زلزلہ

8 اکتوبر 2005ء کے تباہ کن زلزلے نے آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد میں قیامت برپا کر دی۔ ہزاروں لوگ جان سے گئے، املاک برباد ہو گئیں، معصوم بچے جاں بحق ہوئے، سکول زمین بوس ہوئے، دفاتر صفحہ ہستی سے مٹ گئے، ہسپتالوں کا نام و نشان نہ رہا۔ رمضان المبارک کی وجہ سے لوگ حسبِ معمول روزے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ دفاتر اور دوکانوں پر جا چکے تھے اور باقی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ زمین نے انگڑائی لی، دھرتی کا سینہ کانپنے لگا، اِس کی تہوں میں شکست و ریخت شروع ہوئی۔ فلک بوس پہاڑوں میں دھماکے گونجنے لگتے۔ پہلے تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ ایک معمول کا زلزلہ ہے جلد تھم جائے گا لیکن یہ تھمنے کے بجائے شدت اختیار کر گیا۔ زمین کو قرار نہیں آ رہا تھا بڑی بڑی عمارتیں، مکانات، پلازے اور ہوٹل بُری طرح کانپ رہے تھے۔ یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں تقریباً دو منٹ میں ہر چیز تلپٹ ہو گئی۔ ہر چیز منہدم ہو گئی تھی پیارے ملبے کے نیچے دب گئے تھے ہلاکت خیزی نے منہ کھول لیا تھا اور حیات انسانی پناہ کی تلاش میں تھی لیکن وہ ناپید ہو گئی تھی۔ زلزلے کی حشر سامانیوں نے ملک بھر میں کہرام برپا کر دیا۔ مظفر آباد، راولا کوٹ، باغ، بالا کوٹ اور بٹگرام تک پہاڑ سرنگوں ہو گئے تھے۔ اسلام آباد سے لاہور تک زمین کانپ اُٹھی تھی۔ ابتدائی لمحات میں اسلام آباد کے مارگلہ ٹاورز کے منہدم ہونے اور جانوں کے نقصان کی دل ہلا دینے والی خبریں ٹی وی اور ریڈیو پر سنائی دے رہی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلاکت، بربادی اور تباہی کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرتا گیا اور معلوم ہوا کہ آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے چند بالائی حصے شدید تباہی کا

شکار ہوئے ہیں۔ ان کی خبریں سن کر دنیا مضطرب ہوگئی۔ ہر آنکھ آشکبار ہوئی۔ ہر دل پژمردہ ہوا۔ ہر شخص افسردہ ہوا۔

نواز شریف بھی اس سے بے خبر نہ تھے اُن کے دل میں اضطراب اور پریشانی کی لہریں اُٹھ رہیں تھیں۔ 9 اکتوبر 2005ء کی سہ پہر مجھے اُن کا فون آیا حسبِ معمول کہا: ''اسلام علیکم! میں جدہ سے نواز شریف بول رہا ہوں'' ساتھ ہی پوچھا کہ زلزلے نے کہاں تک اور کتنی تباہی پھیلائی ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ مظفر آباد، باغ، راولا کوٹ اور بالاکوٹ تقریباً نوے فیصد تباہ ہوگئے ہیں، کئی قصبے اور دیہات صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ تفصیل سننے کے بعد میاں صاحب نے کہا: ''نہیں نہیں، نوے فیصد تباہی نہیں ہوئی ہوگی'' اُن کی حیرانی اور غیر یقینی بجا تھی کیونکہ تباہی کی مکمل رپورٹنگ نہیں ہوئی تھی اور دنیا بھر کے لوگ اس سے لاعلم تھے۔ زلزلے سے متاثرہ علاقوں کو جانے والے تمام راستے مسدود ہوگئے تھے۔ مواصلات کا نظام تباہ ہوگیا تھا۔ ذمہ داران اصل واقعات کی نشاندہی نہیں کر رہے تھے اس پس منظر میں میاں نواز شریف کا میری رپورٹنگ کے بارے میں خدشات کا اظہار بجا تھا اور پھر اُن کا فون بند ہوگیا۔

میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے مختلف عہدیداروں اور ڈاکٹروں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہوگیا۔ طبی امداد کی فراہمی کے لیے مختلف ٹیمیں متاثرہ علاقوں کی طرف روانہ کی جارہی تھیں۔

اگلے روز نواز شریف کا مجھے دوبارہ فون آیا کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب آپ نے جو کہا تھا وہ درست ہے بہت تباہی ہوئی ہے میں اس ضمن میں کیا کر سکتا

ہوں'' میں نے عرض کیا فوری طور پر مظفر آباد میں فیلڈ ہسپتال قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ کہنے لگے: اخراجات کتنے ہوں گے؟ پھر خود ہی فرمایا، میں نے مسلم لیگ (ن) کو پچاس لاکھ روپے بطور زلزلہ فنڈ فراہم کر دیے ہیں آپ فوری طور پر فیلڈ ہسپتال کا پورا منصوبہ بنا کر مجھے فیکس کریں اور ظفر اقبال جھگڑا سے رابطہ کریں۔

نواز شریف کی بے قراری اور پریشانی سے عیاں تھا کہ وہ فوری طور پر متاثرین کے لیے ہر ممکن امداد کی فراہمی چاہتے ہیں۔ میں گیارہ اکتوبر کو بڑی مشکل سے مظفر آباد پہنچا، وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ شہر بے مثال جو دریائے نیلم اور دریائے جہلم کے سنگم پر واقع تھا خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا محض کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔ اسی ہزار افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ لاشوں کے انبار نے اسے قبرستان بنا دیا تھا۔ جنازہ پڑھانے اور دفنانے میں شدید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ عجیب بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا۔

میں 12 اکتوبر کو مظفر آباد میں تھا، پورے شہر کا دورہ کیا، امدادی کارروائیوں میں شریک رہا۔ فیلڈ ہسپتال کے لیے جگہ کا انتخاب کیا اور لاہور واپس آ گیا۔ اس دوران میاں صاحب دن میں کئی بار فون کرتے۔ اُن کے حکم پر ہم نے دو دن میں مکمل فیلڈ ہسپتال تیار کیا۔ چھ ٹرکوں، دس ویگنوں اور چھ سات کاروں پر مشتمل کارواں مظفر آباد پہنچ گیا۔ آپریشن تھیٹر، بے ہوشی کا سامان، آلاتِ جراحی اور ایکسرے پلانٹ اتفاق ہسپتال اور شریف میڈیکل سٹی نے فراہم کیا۔ پچاس عدد ڈاکٹروں پر مشتمل ٹیم جس میں لیڈی ڈاکٹرز بھی شامل تھیں لاکھوں روپے کی مالیت کی ادویات کے ہمراہ 16 اکتوبر کی صبح مظفر آباد پہنچ گئی۔ پیرا میڈیکل سٹاف اور رضا کاروں کے ہمراہ ہم نے نوے افراد کا عملہ حاصل کر لیا تھا۔

میاں صاحب جدہ میں بیٹھ کر نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی طرف سے بار بار فون کے ذریعے ہدایات واحکامات جاری ہو رہے تھے۔ ہم نے مظفرآباد پہنچتے ہی آزاد کشمیر یونیورسٹی نیو کیمپس کے گراؤنڈ میں فیلڈ ہسپتال قائم کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ لائے ہوئے آٹھ سو لیٹر پینے کے پانی اور تقریباً آٹھ سو لیٹر ڈیزل کے ٹینک زمین میں نصب کر دیے اور اپنے ساتھ لائے ہوئے طاقتور جنریٹرز کو آن کیا۔ اس سے روشنیاں جل اُٹھیں۔ بلب روشن ہوتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ جل اُٹھے کیونکہ وہاں پر کئی دنوں سے تاریکی کی حکمرانی تھی اور بجلی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہمارے فیلڈ ہسپتال کے قریب ہی فوج کا کیمپ تھا وہاں بھی روشنی کا اہتمام نہیں تھا اُن کی درخواست پر ہم نے انہیں بھی بجلی فراہم کر دی۔

ہمارے ساتھ پانچ مسلح سیکورٹی گارڈ تھے جو بعدازاں بہت فائدہ مند ثابت ہوئے متاثرہ علاقوں میں جرائم پیشہ افراد نے کی لوٹ مار کو انہوں نے ناممکن بنا دیا۔

رمضان کا مہینہ تھا سحری اور افطار میں دال چاول یا سبزی گوشت کا اہتمام کیا جاتا تھا جس سے ہمارے سٹاف کے علاوہ تقریباً دو سو افراد استفادہ کرتے تھے۔

ہم نے خیموں پر مشتمل فیلڈ ہسپتال پر میاں نواز شریف کی دو بڑی تصویریں آویزاں کر دی تھیں جنہیں دیکھ کر لوگ دور دور سے آجاتے تھے اور نواز شریف کی تعریف کرتے تھے میں نے نواز شریف کو آزاد کشمیر میں بہت ہر دلعزیز پایا۔ ہسپتال کے کام شروع کرتے ہی مریضوں اور زخمیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُن کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ دن رات کام کرنے سے ہمارے ساتھیوں کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ بعض پیٹ اور گلے کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں

نے ہمت نہ ہاری روزہ اور بیماری کی حالت میں بھی کام کرتے رہے۔ ہمارے ساتھ جانے والی خواتین ڈاکٹرز نے بہت ہمت، جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

ہمارے کام سے متاثر ہو کر ہلال احمر، متحدہ عرب امارات کے انچارج محمد الفہد نے اپنے امدادی کام کی ذمہ داری بھی ہمیں سونپ دی۔ ہم سارے ڈاکٹر رات بھر مظفر آباد اور گرد ونواح میں گھوم کر متاثرہ اور بیمار افراد کو تلاش کرتے، انہیں ہسپتال لاتے، ادویات خیمے اور بستر فراہم کرتے۔ یہ جذبہ دیکھ کر ٹیویوٹا انڈس موٹرز کے چیئرمین صاحب نے ہمیں دس عدد جیپیں دیں جن کے انچارج اُن کے منیجر علی تھے۔ ان کے ذریعے دور دراز کے پہاڑی علاقوں تک رسائی ہوئی اور زخمیوں کو ہسپتال تک لانے میں آسانی ہوگئی۔

میاں نواز شریف کی زبردست اعانت اور توجہ سے قائم کیے گئے اس فیلڈ ہسپتال میں آٹھ ہزار مریضوں کا علاج کیا گیا۔ اسّی بڑے آپریشن کیے گئے۔ لاتعداد چھوٹے آپریشن اور مرہم پٹی بھی کی گئی۔ اس دوران مسلم لیگ (ن) کے راہنما راجہ ظفر الحق، ظفر اقبال جھگڑا، نادر پرویز، مہتاب عباسی، بیگم وجعفر اقبال اور دیگر کئی راہنما اور ورکر تشریف لائے انہوں نے ہماری تعریف کی آپریشن تھیٹر کے دورے کے موقع پر ایک صاحب نے دس ہزار روپے اور نادر پرویز صاحب نے چار ہزار روپے کیش عطیہ دیا۔ ملک شجاع نے راجہ ظفر الحق کی ہدایت پر ''موتمر عالم اسلامی'' کی طرف سے فراہم کیے گئے دو ٹرکوں پر مشتمل امدادی سامان بھی ہمیں دیا۔ تاکہ ہم اسے پہاڑی علاقوں میں تقسیم کر دیں ہماری خدمت کا انداز دیکھ کر ایک روز آرمی ایویشن کے دو افسران ہمارے پاس آئے اور کہا انہیں دور دراز کے علاقوں میں بذریعہ ہیلی کاپٹر جانے کے لیے ڈاکٹر درکار ہیں۔ ہم نے انہیں ڈاکٹر دے دیے۔

ہمارے دو ڈاکٹر روزانہ ہیلی کاپٹرز پر بیٹھ کر اُن کے ساتھ جاتے اور دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں اپنا میڈیکل کلینک قائم کرتے دو دن قیام کے دوران ادویات کی فراہمی اور سرجری کرنے کے بعد واپس بیس کیمپ میں آجاتے۔ کئی بار شدید زخمی افراد کو ساتھ لے آتے۔ جنہیں علاج، رہائش اور کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔

سترہ اکتوبر کو، موبائل فون نے کام شروع کر دیا تھا، جناب نواز شریف کا روزانہ رات گئے فون آتا وہ سارے دن کی کارکردگی کا احوال پوچھتے زخمیوں اور ضرورت مندوں کی رپورٹ سنتے۔ مجھے اُن کی اس دلچسپی پر رشک بھی آتا اور حیرانی بھی ہوتی کہ وہ کس جانفشانی سے اس عمل میں شریک ہیں۔ ساری باتوں کا خیال رکھ رہے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہم رات دو بجے کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر دراز ہوئے ہی ہوتے تھے کہ اُن کا فون آجاتا اور عموماً چالیس سے پینتالیس منٹ تک جاری رہتا وہ ہر تفصیل جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اکثر ایک ہی بات کہتے تھے: ''کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔'' ہم بھی یہی کوشش کر رہے تھے کہ نواز شریف فیلڈ ہسپتال میں آنے والا کوئی شخص مایوس نہ ہو۔ کیمپ کے قیام کے دس دن بعد میاں شہباز شریف کے حکم پر زعیم قادری، خواجہ سعد رفیق، بلال یٰسین، میاں مرغوب، خواجہ عمران نذیر اور کئی دیگر راہنما لاہور سے بارہ ٹرکوں پر مشتمل امدادی سامان لے کر آئے اور تقسیم کیا۔

مظفر آباد اور اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں ہم نے ڈیڑھ ہزار خیمے فراہم کیے۔ پانچ سو بوری چاول، پانچ سو بوری چینی، دو ہزار کمبل، چار ہزار جرسیاں، دو ہزار جوتے اور دیگر اشیاء ضرورت بھی۔

پانچ بڑی ڈسپنسریاں قائم کیں اور انہیں تین ماہ تک کے لیے ادویات فراہم کیں اس دوران امریکہ، برطانیہ اور آئرلینڈ سے میرے بہت سے ڈاکٹر دوست آزاد کشمیر میں آئے اور متاثرین کی خدمت کی ان میں ڈاکٹر اشرف چوہان، ڈاکٹر عثمان امیر خان، ڈاکٹر توقیر، ڈاکٹر عزم شاہ، ڈاکٹر انوار الحق، ڈاکٹر سعید احمد اور ڈاکٹر محمد شہزاد نمایاں ترین ہیں۔ یہ وہ ڈاکٹر ہیں جو عالمی شہرت رکھتے ہیں ماہانہ لاکھوں کماتے ہیں عرصہ دراز سے بیرون ملک مقیم ہیں لیکن اپنی مصروفیات کے باوجود اپنے بھائیوں کی امداد کے لیے مظفرآباد پہنچے نہ صرف مفت علاج کیا بلکہ اپنی جیب سے لاکھوں روپے مستحقین میں تقسیم کیے۔ میں ان کی خدمات کے بارے میں میاں صاحب کو مطلع کرتا رہا اپنے کیمپ میں موجود چینی اور مصری ڈاکٹروں سے اُن کی بات بھی کروائی۔ آئرلینڈ سے ڈاکٹر افضال خالد نے اپنی بیماری کے باوجود ہر ممکن مدد فراہم کی۔ انہوں نے بذاتِ خود ان سب ڈاکٹروں کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا کیونکہ انہوں نے ایک فراموش کردار ادا کیا تھا۔ آزاد کشمیر کے وہ لوگ جوان ڈاکٹروں کے نام اور مقام سے بھی واقف نہیں تھے اُن کی محبتوں اور شفقتوں کو تاعمر یاد رکھیں گے۔

ڈاکٹروں کے علاوہ ساجد عمر گل، زاہد حسین اور بہت سے دوست بیرونِ ملک سے تشریف لائے اور رضا کارانہ طور پر کام کیا۔ ساجد گل نے بڑی جانفشانی سے خدمت کی۔ مظفرآباد کے لوگ انہیں آج بھی یاد کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں اپنے دوستوں کے ساتھ خدمات انجام دینے کے بعد میں 3 نومبر 2005ء کو جدہ پہنچا نواز شریف صاحب سے ملاقات کی انہوں نے میرا زبردست استقبال کیا۔ محبت شفقت اور برادرانہ احترام سے نوازا، جو میرے لیے

سرمایہ حیات رہے گا۔ سرور پیلس میں جس طرح مجھے خوش آمدید کہا گیا اُس سے میری خوشی اور اطمینان میں اضافہ ہوا اور از خود مسرّت ہوئی جب یہ بتایا گیا کہ جب میاں صاحب رات گئے دیر تک مجھ سے فون پر بات کرتے تھے اور زلزلہ زدگان کے بارے میں تفصیل پوچھتے تھے اُس وقت اُن کے موبائل فون کا سپیکر آن کر دیا جاتا تھا تاکہ اردگرد موجود لوگ بھی سنیں کہ وہاں کیا حالات ہیں اور کیا امدادی کام ہو رہا ہے۔

میں نے میاں صاحب کو قیامت خیز زلزلے اور امدادی کاروائیوں کی تصاویر پیش کیں تو آبدیدہ ہو گئے اور کہا: ''اگر حکمران صحیح وقت پر فیصلہ کرتے تو نقصان کی شدت کم ہو سکتی تھی۔'' وہ اس پر بھی ناراض تھے کہ کئی اعلیٰ حکومتی عہدیدار غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور اصل حقیقت سے عوام کو آگاہ نہ کیا۔ انہی دنوں شام کی مجالس کے دوران انہوں نے میری کئی مرتبہ تعریف کی جو دراصل اُن کی ذرّہ نوازی تھی۔ ایک دن نمازِ مغرب سے قبل حسین نواز نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر صاحب آپ مجاہد ہیں'' مجھے یہ توصیفی کلمات سن کر محسوس ہوا کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اللہ اس کا اجر دے گا۔ ''انشاءاللہ''

حسن نواز کی علالت

یہ نومبر 2005ء کا ذکر ہے۔ زلزلے کے بعد میں جدہ میں تھا کہ میاں نواز شریف کے چھوٹے صاحبزادے حسن نواز کی بیماری کے بارے میں خبر شائع ہوئی۔ پاکستان کے ایک انگریزی اخبار نے اپنے صفحہ اول پر یہ انکشاف کیا تھا کہ حسن نواز کے دماغ میں سرطان ہے۔ میں نے میاں نواز شریف سے حسن نواز کی بیماری کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگے: ''ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ انہیں 'ملٹی پل سکلیروسس' ہے اور اس کی تشخیص لندن میں ہوئی ہے۔ جدہ میں بھی یہی تشخیص کی گئی ہے۔'' وہ حسن کی بیماری سے پریشان تھے اور اُن کی صحت کے لیے دعا گو تھے۔ میں نے بیماری کا نام سنا تو میاں صاحب سے پوچھا: ''کیا حسن نواز کو ابتدا میں آنکھوں میں دھندلاہٹ ہوئی تھی یا چلنے میں کوئی دشواری پیش آئی تھی؟'' یہ سن کر میاں صاحب چونکے میری جانب دیکھا اور کہا: ''جی پہلے آنکھوں میں پرابلم ہوئی تھی'' اس کے بعد میں نے اس مرض کے بارے میں تفصیل بیان کی اور کہا: ''یہ قابل علاج ہے اور اس بیماری میں مبتلا لاکھوں لوگ نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔''

آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں قارئین کو بتاتا چلوں کہ یہ بیماری کیا ہے؟

ملٹی پل سکلیروسس 'ایم ایس' (Multiple Sclerosis) دراصل ایک ایسا مرض ہے جو اعصاب پر اثر کرتا ہے۔ ابتدائی علامات میں مریض کو نظر کی دھندلاہٹ، چلنے میں دشواری، سانس لینے میں دشواری یا چکر اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ جسم کے اعضاء میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ سترہ سے تیس برس تک کی عمر کے

نوجوان اس کا شکار ہوتے ہیں۔ ابھی تک اس کی وجوہ معلوم نہیں ہو سکیں۔ یورپ اور امریکہ میں اس کے بارے میں ریسرچ جاری ہے کیونکہ یہ وہاں عام ہے اور لاکھوں افراد اس کا شکار ہیں۔ مریضوں نے اس بیماری کے حوالے سے کلب اور تنظیمیں بھی بنالی ہیں۔ اس مرض کی شاعری بھی وجود میں آچکی ہے۔ اس میں مبتلا افراد سٹیرائیڈز (Steroids) سے علاج کے بعد صحت مند زندگی گزارتے ہیں کئی افراد میں یہ بیماری بار بار عود کر آتی ہے جس کی وجہ سے جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ آج کل اس کے لیے مہنگے ٹیکے انٹرفیرون (Interferon) بھی استعمال ہو رہے ہیں اور اُن کے نتائج اچھے ہیں۔ یورپ میں اس بیماری کی صورت میں لوگ چند روز ڈیوٹی سے چھٹی لے کر علاج کرواتے ہیں اور پھر کام پر حاضر ہو جاتے ہیں۔

میاں نواز شریف نے مجھ سے اس بیماری کے بارے میں معلومات سنیں تو پوچھا: ''آپ کو اس بیماری کے بارے میں اتنی معلومات کیسے ہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''ہر ڈاکٹر کو یہ معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔

میاں صاحب کی عادت کہ وہ ہر بات کی تہہ میں جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی تشنگی نہ رہے اور تمام معلومات دسترس میں ہوں۔ وہ ان دنوں اکثر حسن کی بیماری کے بارے میں بات کرتے تھے میں نے ایک روز پوچھا: ''حسن زیادہ ذہنی دباؤ اور تناؤ میں تو نہیں رہے؟'' میاں صاحب نے کہا: ''وہ بہت تناؤ میں رہے ہیں جب ہم سب پابند سلاسل تھے، ہم سے ظلم و زیادتی ہو رہی تھی ایسے میں صرف حسن نواز آزاد تھے اور ہماری رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے اس وجہ سے وہ دباؤ میں تھے۔''

اگلے روز ایک ملاقات میں میاں صاحب نے بتایا: ''کہ حسن نواز چند روز پیشتر لندن جا چکے ہیں اور ہم بھی وہاں جانا چاہتے ہیں تاکہ اُن کا بہترین علاج کروایا جاسکے۔ مگر حکومتِ پاکستان پاسپورٹ جاری نہیں کر رہی۔ میں پاکستان کا شہری ہوں دو بار وزیراعظم رہ چکا ہوں یہ سلوک ناقابلِ فہم ہے۔'' طویل انتظار کے بعد بالآخر نومبر کے وسط میں پاسپورٹ جاری ہو گیا۔ لیکن برطانیہ کا ویزہ لگنے میں تاخیر ہو گئی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے ایک شام میری ملاقات شریف میڈیکل سٹی کے منتظم کرنل (ر) ظفر سے ہوئی وہ ایک شریف النفس اور حلیم الطبع انسان ہیں دیانتدار اور محنتی ہیں۔ میاں صاحب کے داماد کیپٹن صفدر کے عزیز ہیں۔ بحرین میں پاکستان کے سفیر تھے۔ نواز شریف صاحب کی معزولی کے بعد سے وہ شریف میڈیکل سٹی میں فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جدہ میں ایک شام انہوں نے نواز شریف کو شریف میڈیکل سٹی کے بارے میں بریفنگ دی۔ میرے استفسار پر میاں صاحب نے بتایا: ''میرے والد محترم نے تین مربعے زمین وقف کر کے اس پر یہ ہسپتال اور تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں۔ ہسپتال میں غریب مریضوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ کڈنی سینٹر میں ڈائلیسیس اور ٹرانسپلانٹ کا شاندار اور قابلِ اعتبار انتظام ہے۔ ہسپتال کے مریضوں اور سکول کے طلبا و طالبات کے لیے ٹرانسپورٹ فراہم کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ غاصب حکومت نے ہمارے تمام فلاحی منصوبے روک رکھے ہیں حالانکہ ان سے عام آدمی فائدہ حاصل کرتا ہے۔''

کرنل ظفر کی بریفنگ کے بعد میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب شریف میڈیکل سٹی میں کیا اضافہ ہو سکتا ہے اس کی صلاحیت کیسے بڑھ سکتی

ہے۔‘‘میں نے کہا: ’’تین مربعوں یعنی 175 ایکڑ کو محیط جگہ پر جدید میڈیکل یونیورسٹی بنی چاہیئے۔ دنیا بھر سے طلبا و طالبات کو داخلہ دینا چاہیئے۔ اچھا بورڈنگ ہاؤس بنانا چاہیئے۔ ریسرچ اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے ادارہ قائم ہونا چاہیئے۔ جدید آلات نصب کرنے چاہئیں‘‘ میاں صاحب ان تجاویز پر خوش ہوئے اور کہا: ’’پاکستان جا کر شریف میڈیکل سٹی کا دورہ کریں اور کرنل ظفر کے ساتھ مل کر کام کریں اور تجاویز کے مطابق منصوبے شروع کریں۔‘‘ میں چند ہفتے بعد واپس لاہور آیا، ایک روز شریف میڈیکل سٹی دیکھنے گیا۔ یہ پراجیکٹ، عمارت کا طرزِ تعمیر، سٹاف کا رویہ، ہسپتال کے آلات، ساز و سامان اور حسن انتظام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بنانے والوں اور انتظام چلانے والوں کا جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ اس پراجیکٹ سے وابستہ سبھی لوگ فرض شناس ہیں۔ میاں محمد شریف صاحب کی وفات کے بعد اس پراجیکٹ کی رفتار سست ہوگئی ہے۔ افسوس ہے کہ حکومتیں افراد سے دشمنی میں مفید اور کار آمد منصوبوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

میں نواز شریف کی ذات گرامی کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں...... کہ جلاوطن ہو کر بھی انہوں نے شریف میڈیکل سٹی کو چلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اس کی اعانت کا سلسلہ جاری رکھا کسی بھی سہارے یا مدد کے بغیر سارے مالی اخراجات برداشت کر رہے ہیں، اور اس کے تمام معاملات میں ہر طرح شریک ہیں۔

شریف میڈیکل سٹی کے بارے میں بریفنگ کے بعد نواز شریف نے نمازِ جمعہ کے لیے جاتے ہوئے مجھے کہا: ’’آیئے نماز پڑھ کر آتے ہیں اور پھر اکٹھے دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔‘‘ میں وضو کر کے باہر آیا تو دیکھا وہ اپنی سیاہ مرسیڈیز کے ساتھ کھڑے منتظر ہیں میں جلدی سے آگے بڑھا انہوں نے مجھے گاڑی کی پچھلی

نشست پر حسین نواز کے ہمراہ بیٹھنے کے لیے کہا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ (سعودی عرب میں اہم شخصیات کار کی اگلی نشست پر بیٹھتی ہیں)۔ گاڑی حفاظتی کاروں اور عملے کے ہمراہ ساحل سمندر کی طرف چل دی، کیپٹن صفدر، سہیل ضیاء بٹ، عباس شریف اور دیگر لوگ اپنی اپنی کاروں میں پیچھے ہو لیے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ہماری منزل سمندر کے کنارے وہ مسجد تھی جو 'قصر سلام' کے ساتھ واقع ہے۔ اس خوبصورت مسجد میں شیوخ اور اہم لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔ امام نے مختصر اور پُراثر خطبہ دیا۔ میں نماز کے بعد مسجد سے باہر آیا تو دیکھا کہ میاں صاحب کی گاڑی کے قریب وہیل چیئر پر ایک معذور آدمی اور چند ضرورت مند منتظر ہیں۔ اُن کی نظریں مسجد کے مرکزی دروازے پر ہیں۔ میاں صاحب باہر نکلے تو وہ سب اُن کی طرف بڑھے میاں صاحب نے اُن سے مصافحہ کیا اور لفافوں میں بند رقم تقسیم کردی۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ مجھے میاں صاحب کے ڈرائیور نے بتایا کہ یہ اُن کا معمول ہے وہ جمعہ کے روز نماز کے بعد ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ضرورت مند افراد شامل ہوتے ہیں۔

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد ہم واپس سرور پیلس کے صدر دروازے پر پہنچے تو وہاں بھی چند افراد منتظر تھے میاں صاحب نے گاڑی روک کر انہیں محل کے اندر بلا لیا اور حسبِ استطاعت اُن کی امداد کی۔ ان میں ایک مراکشی بھی تھا جو کافی دیر تک محل میں موجود رہا اور کھانا بھی ہمارے ساتھ کھایا۔ بعد ازاں تحفے اور امداد لے کر رخصت ہوا۔

انہی دنوں جدہ میں قاری شکیل، میاں صاحب کے پاسپورٹ کے اجراء

کے لیے پاکستانی سفارت خانے جاتے اور ناکام لوٹ آتے تھے۔ میاں صاحب حسن کے علاج کے لیے جلد از جلد لندن جانا چاہتے تھے لیکن حکومت تاخیری حربے استعمال کر رہی تھی۔ اس موقع پر بھی سودے بازی کی کوشش جاری تھی سرکاری اور غیر سرکاری ایلچی آ جا رہے تھے لیکن حکومت نواز شریف کو جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ جرأت سے ہر زیادتی کا مقابلہ کر رہے تھے اور اُن کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ ایک شام کی محفل میں ممتاز کالم نگار نصرت مرزا بھی شریک تھے وہ صاحب اسلوب اخبار نویس ہیں کراچی سے تعلق ہے، اُن کی تحریروں میں پاکستان سے محبت نمایاں ہے۔ نواز شریف نے ان کی تحریروں کی تعریف کی اور انہیں بتایا حکومت کی خواہش ہے کہ انہیں پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور دباؤ میں لا کر کوئی سودے بازی کر لی جائے۔

سولہ یا سترہ نومبر کو پاسپورٹ جاری ہونے کے بعد لندن کا ویزہ ملنے میں تاخیر ہوئی۔ جنوری 2006ء کے آخری دنوں میں نواز شریف لندن روانہ ہو گئے اور پھر دو ہفتہ بعد حسن کو علاج کے لیے سوئزرلینڈ لے گئے۔

سرور پیلس میں آخری مجلس

میں 19 نومبر 2005ء کو سرور پیلس جدہ میں آخری بار نواز شریف صاحب سے ملا۔ لندن جانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں، سامان جا چکا تھا۔ مہمانوں کی بڑی تعداد محل میں موجود تھی مجلس برپا تھی، ہال بھرا ہوا تھا، مسلم لیگی راہنماؤں میں چوہدری نثار علی خان اور اسحاق ڈار نمایاں تھے۔ سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات سے آئے ہوئے لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ نواز شریف سے محبت کرنے والے برطانیہ اور امریکہ میں مقیم پاکستانی بھی وہیں تھے۔ میزبان سہیل ضیاء بٹ، عباس شریف، حسین نواز، عزیز عباس، کیپٹن صفدر اور اُن کے بیٹے مہمانوں کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔

حسبِ معمول پاکستان کی سیاست اور معیشت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ جنرل پرویز مشرف کی تباہ کن پالیسیوں اور ناکامیوں کا تذکرہ جاری تھا۔ نواز شریف کی حکومت کے دونوں ادوار بھی زیرِ بحث تھے۔ نواز شریف خاموشی سے سن رہے تھے۔ چند دوست متاثرین زلزلہ کی مشکلات بیان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ آنے والے دنوں میں بڑھتی ہوئی سردی میں حالات مزید خراب ہو جائیں گے۔ مشرف حکومت اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام ہوئی ہے، یہ موضوعات بھی زیر بحث تھے کہ گذشتہ چھ برس کے دوران جنرل مشرف پاکستان کو بہت پیچھے لے گئے ہیں اور ان کے اقدامات نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے عوام کو مایوس کیا ہے۔ اسی دوران وہاں موجود احسن اقبال نے بتایا کہ جنرل مشرف نے چھ سو سے زائد حاضر سروس اور ریٹائرڈ جرنیلوں کو پاکستان کے اعلیٰ ترین اور منافع بخش محکموں کا سربراہ بنا

رکھا ہے جس سے عوام ناراض ہیں۔ وہ ہر محکمے اور اُس میں ہر عہدے پر تعینات جرنیل کا نام لے کر حاضرین کو اس بارے میں بتا رہے تھے۔ سننے والے مبہوت بھی تھے اور حیرت زدہ بھی۔ سہیل ضیاء بٹ نے بلند آواز میں کہا: ''لگتا ہے پاکستان بنایا ہی جرنیلوں کے لیے گیا تھا۔''

یہ باتیں جاری تھیں میں نے نواز شریف صاحب سے کہا: ''میاں صاحب آپ کو جلاوطن ہوئے چھ برس گزر گئے ہیں، حالات میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے اگر آپ ملک واپس جائیں گے تو آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟''

میاں نواز شریف نے میرا سوال سنا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب مجھ پر اللہ کا بڑا ہی فضل و کرم رہا ہے۔ اُس کے فضل کے دروازے اب بھی مجھ پر کھلے ہیں۔ مجھے اس نے لاتعداد نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔ اور وہ بھی اتنا کہ میں اُس کا شکر نہیں ادا کر سکتا۔ اللہ نے مجھے وہ کچھ بھی دے دیا جس کی لوگ صرف خواہش کر سکتے ہیں۔ میں وزیر خزانہ بنا، دو بار پنجاب کا وزیر اعلیٰ رہا، قائد حزب اختلاف اور دو بار پاکستان کا وزیر اعظم رہا ہوں۔ یہ سب میرے مالک کا کرم ہے۔'' میاں صاحب جذباتی لہجے میں کہہ رہے تھے: ''میں عہدوں کے پیچھے نہیں بھاگتا اور نہ ہی ان میں میرے لیے کوئی کشش باقی رہ گئی ہے۔ اب وطن جا کر میں عہدوں کے لیے نہیں بلکہ عوام کے پامال اور غصب شدہ حقوق کو بحال کرانے کی جدوجہد کروں گا۔ ضروری نہیں کہ میں وزیر اعظم بنوں کوشش اور تمنا یہی ہے سیاست اور اقتدار میں فوج کا راستہ بند کر دوں۔ وہ تمام راستے اور بہانے ختم کر دوں جن سے فوج حکومت پر قبضہ کر لیتی ہے۔''

میاں صاحب نے مزید کہا: ''میں پاکستان جا کر اُن سب افراد کا محاسبہ کروں گا جنہوں نے آئین کو توڑا اس کی حرمت اور تقدیس کو پامال کیا۔ اب یہ سنگین مذاق ہمیشہ کے لیے بند ہو جانا چاہیے۔ میں ہارس ٹریڈنگ کا راستہ بھی روک دوں گا۔ اگر میرا ایک ووٹ بھی کم ہوا تو میں حکومت بنانے کے لیے ہارس ٹریڈنگ نہیں کروں گا۔ جس کی اکثریت ہوگی وہی حکومت کرے گا۔ آخر ہم نے اللہ کو جان دینی ہے، اُس کے حضور پیش ہونا ہے۔''

انہوں نے یہ بھی کہا: ''میں ملک میں جمہوریت کی بقاء اور سیاسی استحکام کے لیے ہر شخص کے پاس جاؤں گا، ہر جماعت سے رابطہ کروں گا، مخالف اور موافق سب کو ایک ایجنڈے پر اکٹھا کروں گا اور ملک میں ہمیشہ کے لیے فوج کی مداخلت کا راستہ بند کروں گا۔'' اس کے بعد محفل اختتام کو پہنچی اور وہاں موجود ایک سعودی عالم سے دعائے خیر کرائی گئی۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں کانووکیشن کے موقع پر یادگار تصویر

نواز شریف ٹرین مارچ کے دوران جلسہٴ عام سے خطاب کرتے ہوئے 1993ء

خالصتان موومنٹ کے سربراہ گنگا سنگھ ڈھلوں کے ہمراہ یادگار تصویر

موٹروے کے افتتاح کے موقع پر گھوڑا ڈانس کا ایک منظر

جم خانہ کرکٹ کلب لاہور میں خوشگوار لمحات

رائے ونڈ اجتماع کے موقع پر دعا میں شمولیت کے لیے آمد

کھلی کچہری لاہور کا ایک منظر ساتھ چھوڑ جانے والے
خواجہ ریاض محمود کے ہمراہ

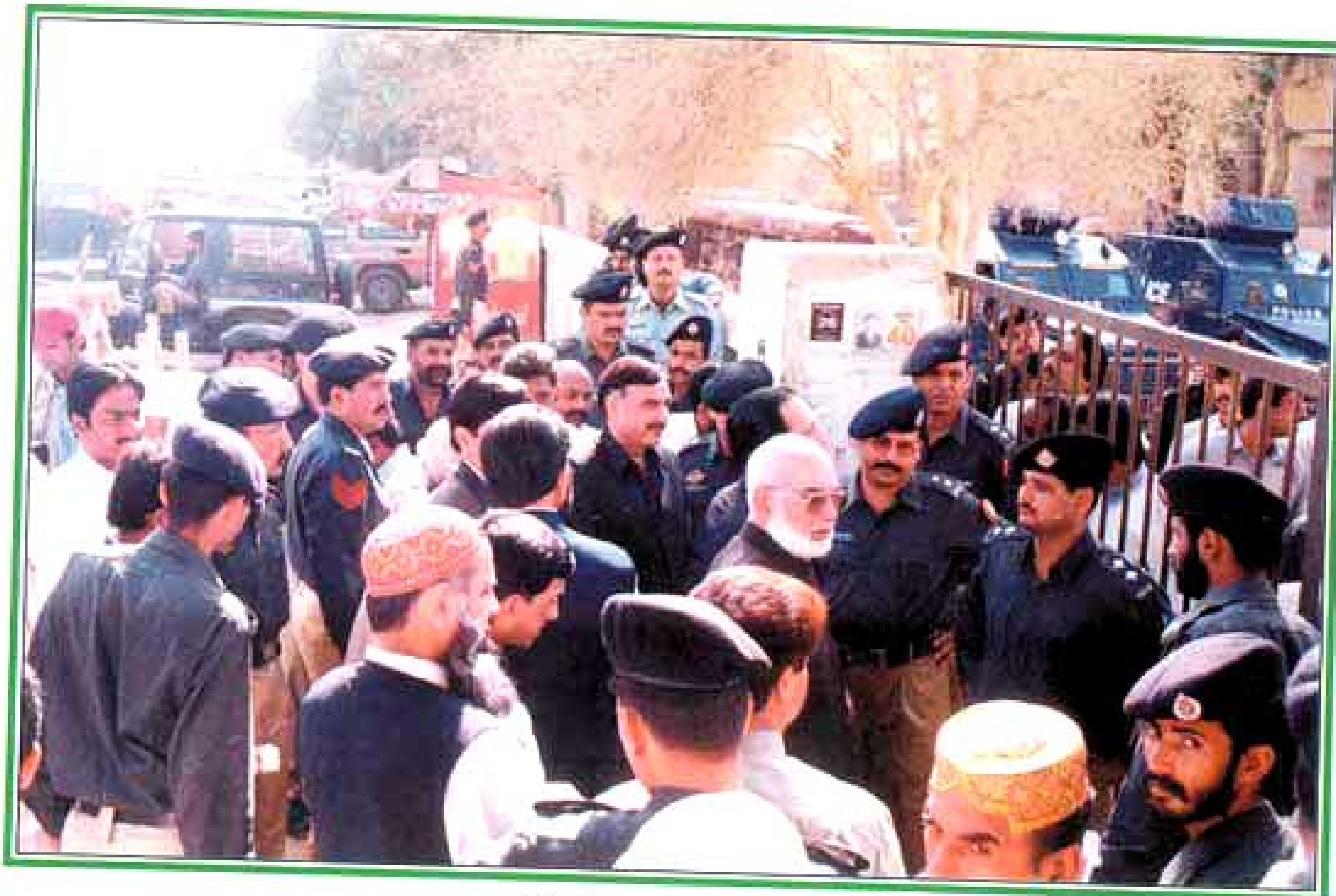

جو وفاداریاں بدل گئے

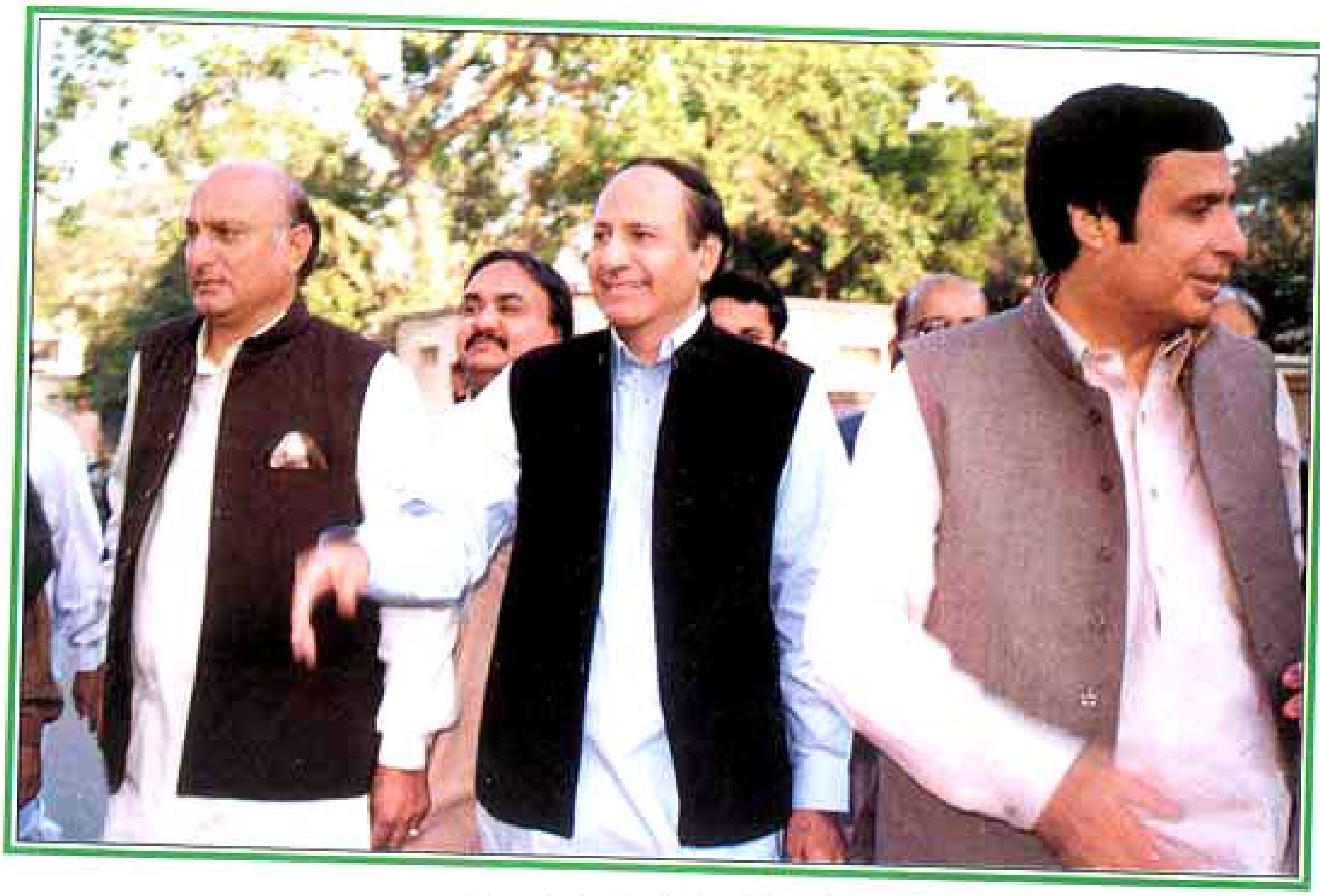

دوست، دوست نہ رہے

جو ساتھ چھوڑ گئے دوست، دوست نہ رہے

اداکار محمد علی (مرحوم) کے ساتھ نواز شریف کی یادگار تصویر

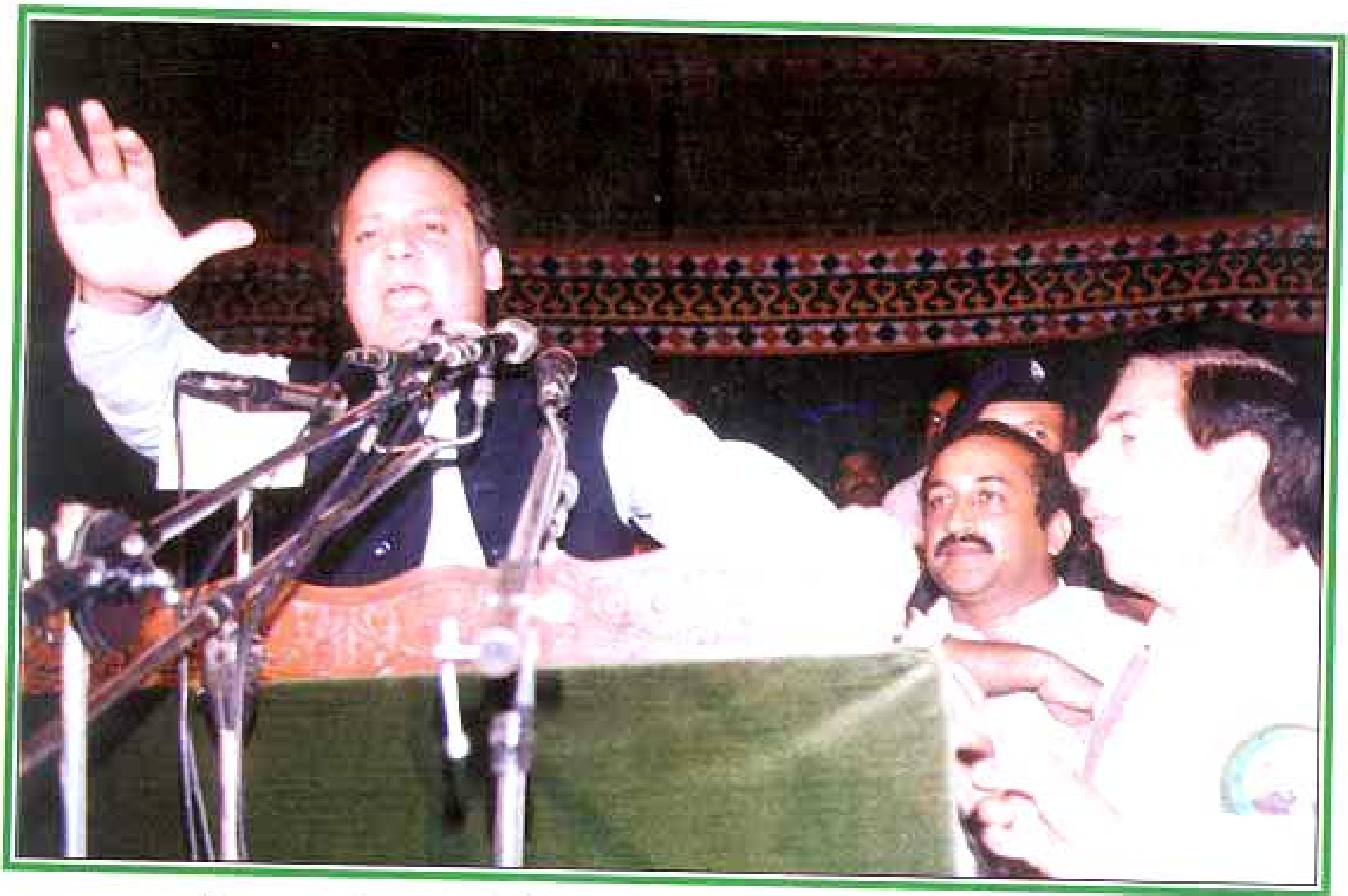

12 اکتوبر 1999ء شجاع آباد میں جلسہ گاہ کی ایک یادگار ترین تصویر

بکتر بند گاڑیوں کا قافلہ

سخت حفاظتی انتظامات میں نواز شریف کی عدالت میں پیشی

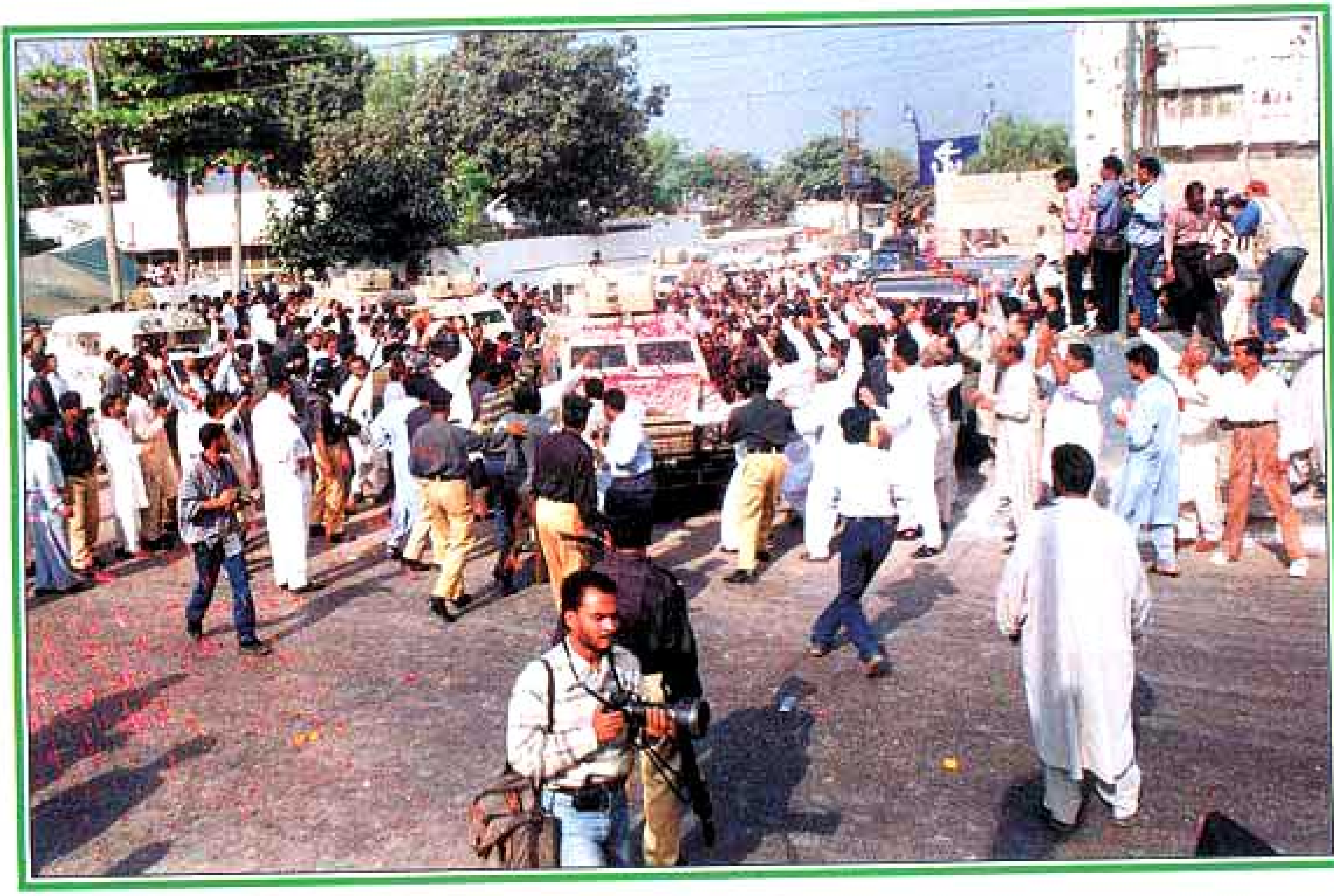

نواز شریف کو عدالت لے جانے والی بکتر بند گاڑی پر گل پاشی کا ایک منظر

کراچی دہشت گردی کی عدالت میں پیشی کے دوران مسلم لیگی خواتین پر
پولیس کا تشدد اور گرفتاری

میاں محمد نواز شریف کو بکتر بند گاڑی میں عدالت لایا جا رہا ہے

نواز شریف کی دہشت گردی کی عدالت میں پہلی پیشی 1999ء

دہشت گردی کی عدالت میں پیشی کے موقع پر جم غفیر

دہشت گردی کی عدالت کے باہر نواز شریف کے لیے ہیلی کاپٹر تیار کھڑا ہے

پرویز رشید فوجی انقلاب کے بعد حراست میں

سرور پیلس کا ایک خوبصورت منظر

سرور پیلس کا بیرونی منظر ہوٹل حیات ریجنسی عقب میں نظر آ رہا ہے

سرور پیلس کا اندر کی جانب سے مین گیٹ اور بچوں کے کھیلنے کا میدان

سرور پیلس کے بائیں جانب کا بیرونی منظر اور کار پورچ

سرور پیلس میں شہباز شریف اور عباس شریف کے لیے
مختص بلاک اور مہمان خانہ

سرور پیلس میں کار پورچ کا ایک منظر

سرور پیلس کی مین عمارت

سرور پیلس میں نواز شریف کے دفتر کا ایک منظر

سرور پیلس میں کھانے کا کمرہ

سرور پیلس جدہ میں نواز شریف کی نشست گاہ

نواز شریف کا دستر خوان

نواز شریف کی نشست اور مجلس گاہ کا ایک منظر

سرور پیلس میں حافظ حسین احمد دعا کروا رہے ہیں

نواز شریف کے زیر استعمال مرسیڈیز S-600 کار ڈرائیور خالد المطیری
ایک معذور شخص نواز شریف سے امداد کا منتظر

سرور پیلس کی بیرونی دیوار کا منظر

لندن میں نواز شریف کے ہمراہ منی بھائی اور عطاالله قاسمی

رؤف طاہر، میاں نواز شریف اور ڈاکٹر سعید الٰہی کی یادگار تصویر نومبر 2005ء

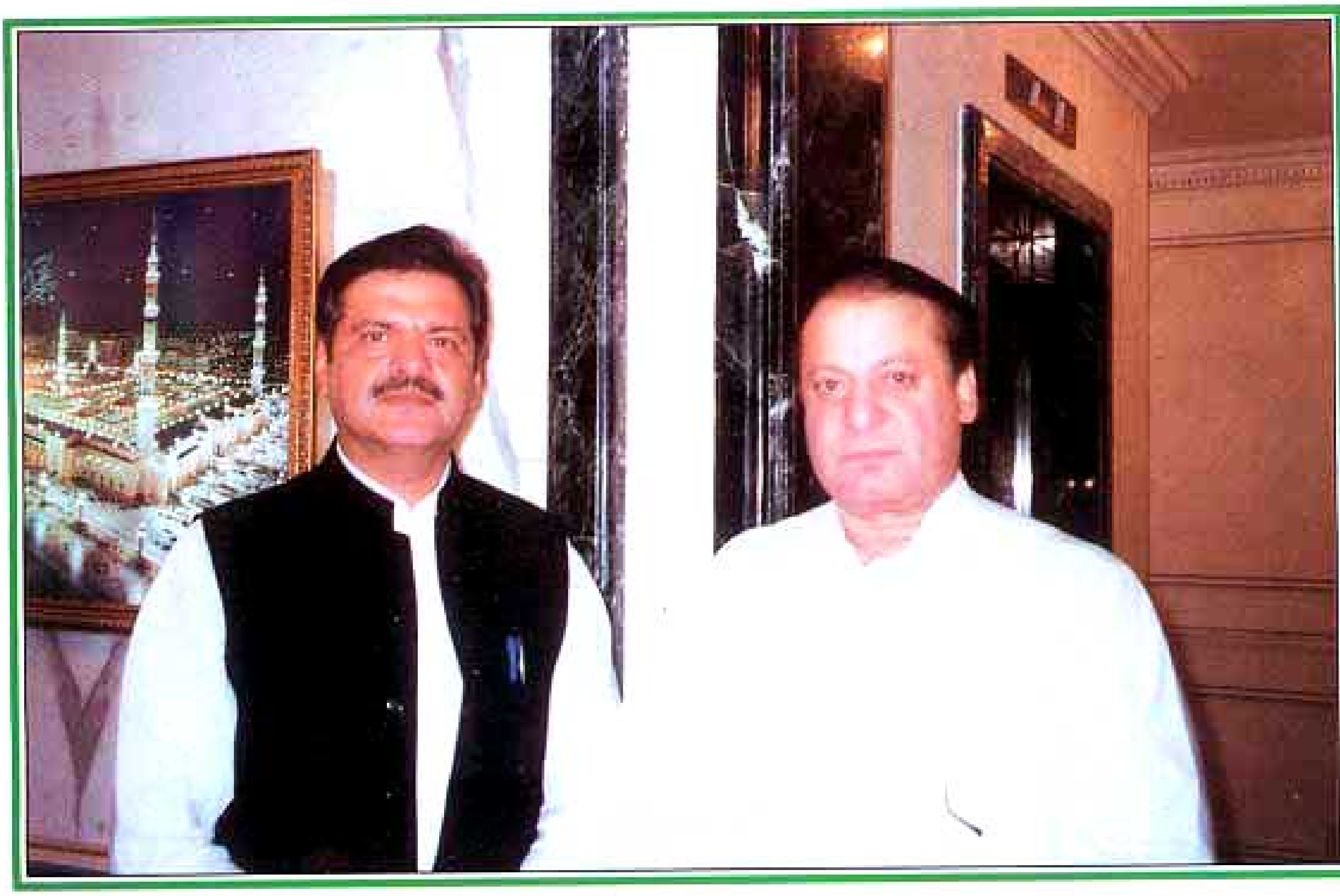

نواز شریف کے ہمراہ ڈاکٹر سعید الٰہی (نومبر 2005ء)

کیپٹن (ریٹائرڈ) صفدر اور ڈاکٹر سعید الٰہی (نومبر 2005ء)

ڈاکٹر عدنان خان اور ڈاکٹر سعید الٰہی

قاری شکیل اور ڈاکٹر سعید الٰہی کی یادگار تصویر (سرور پیلس میں)

سرور پیلس کا بیرونی گیٹ

ڈاکٹر سعید الٰہی خوشگوار موڈ میں

حرفِ آخر

ڈاکٹر سعید الٰہی کو سیاستدانوں میں ڈاکٹر اور ڈاکٹروں میں سیاستدان سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ کل وقتی ڈاکٹر بن جاتے تو آج ان کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین فزیشنز میں ہوتا، اور اگر سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے تو (شاید) مخدوم جاوید ہاشمی کے ساتھ ''دادِ عیش'' دے رہے ہوتے۔

انہوں نے ڈاکٹری اور سیاست اسی طرح کی کہ جیسے فیض احمد فیض نے ''عشق'' اور ''کام'' کیا تھا، جب عشق کرنا چاہیے تھا، ''کام'' میں لگ گئے، جب کام کرنا چاہیے تھا ''عشق'' فرمانے لگے۔ ان میں توانائی بے پناہ ہے، ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں، کبھی لاہور ہیں تو کبھی جدے میں، کبھی دوبئی ہیں تو کبھی لندن میں، گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند۔ اب کے ان کی جوانی دیوانگی سے دور ہوتی جا رہی ہے، وہ سیاست کے معاملے میں سنجیدہ ہو رہے ہیں اور میاں نواز شریف کی تصویر کو دل سے نکال کر ڈرائنگ روم میں سجا چکے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں گذشتہ چند سالوں میں بار بار جدہ جانے اور میاں صاحب سے ملنے کے مواقع ملے۔ ایسے مواقع جو شاید ہی کسی دوسرے پاکستانی مقیم پاکستان کو ملے ہوں، یا اس نے حاصل کیے ہوں۔ نواز شریف ان کے پسندیدہ تو تھے ہی، اب قربت کی بدولت پسندیدگی، محبت اور عقیدت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں ہیں اور چیخ چیخ کر اعلان کر رہے ہیں کہ ''مردِ میدان'' تو بس نواز شریف ہیں۔

''وہ'' مردِ میداں، ''وہ'' ''میر لشکر''
نوری حضوری 'اس' کے سپاہی

ڈاکٹر سعید الٰہی قومی سیاست کے جملہ امراض کے علاج کے لیے نواز شریف صاحب کے نسخہء جمہوریت پر کامل ایمان لے آئے ہیں اور ان کے ساتھ اپنی گفتگوؤں کی روداد بھی قوم تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کی تصنیف ''جلاوطن وزیر اعظم'' جہاں ہمارے ننگے سر کی کہانی سنا رہی ہے، وہاں نیا عزم و حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر سعید الٰہی کی یہ کاوش ''من چلے'' کا سودا ہے کہ۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

مجیب الرحمان شامی
چیف ایڈیٹر 'روزنامہ پاکستان'